اگست ۱۹۷۷ء
عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن کے اجزاء

تفسیر پارۂ اوّل	۶/۵۰ روپے
تفسیر سورہ الفاتحہ والبقرہ	۹/- 〃
تفسیر سورہ التوبہ	۶/۵۰ 〃
تفسیر سورہ الفرقان	۳/- 〃
تفسیر سورہ لقمان	۲/- 〃
تفسیر سورہ یٰسٓ	۲/۲۵ 〃
تفسیر سورہ الفتح	۲/۲۵ 〃
تفسیر سورہ الحجرات	۲/۵۰ 〃
تفسیر سورہ الرحمٰن	۲/۲۵ 〃

اِدارۂ ترجمانُ القرآن، اِچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۷ | اگست ۱۹۷۷ء مطابق شعبان ۱۳۹۷ھ | عدد ۶

اشارات:	عبدالحمید صدیقی	۲
مقالات:		
دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط	جناب نعیم صدیقی صاحب	۹
اسلام کا تصورِ تاریخ	عبدالحمید صدیقی	۲۱
روداد ابتلاء: احمد رائف مصری	جناب خلیل الحامدی صاحب	۳۰
رسائل و مسائل		
مُسلم حکومتوں کے معاملہ میں جماعتِ اسلامی کا مسلک	ابوالاعلیٰ مودودی	۴۱
مطبوعات:	عبدالحمید صدیقی	۴۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بیس روپے - فی پرچہ -/۲ روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نشۂ اقتدار میں بدمست، مضبوط کرسی کے مالک، غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کی محبت کا دم بھرنے والے، برّاعظم ایشیا کی قیادت اور تیسری دنیا کی رہنمائی کے دعویدار مسٹر بھٹو بہ حسرت تمام یکایک شاہانہ اختیارات سے محروم ہوگئے۔ اُن کی اقتدار سے علیحدگی حسرتناک بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ ہم اسے حسرت ناک اس بنا پر قرار دیتے ہیں کہ اگر وہ دھونس دھاندلی کے ذریعہ عوام کی گردنوں پر بالجبر مسلط رہنے پر اصرار نہ کرتے اور اُن کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر مسند اقتدار سے از خود الگ ہوجاتے تو وہ ملک کی سیاسی زندگی میں ایک صحت مند روایت قائم کرنے والے کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جاتے۔ مگر افسوس کہ وہ اپنے نبض شناسی کے دعوے کے باوجود عوامی تحریک کے تقاضوں کا احساس کرنے سے یکسر قاصر رہے اور عوام کی خواہشات کے علی الرغم ایسا فسطائی طرزِ عمل اختیار کیا جس سے بالآخر انھیں مسند اقتدار چھوڑنی پڑی۔

ہم اُن کی اس سیاسی موت کو عبرت انگیز اس لیے سمجھتے ہیں کہ وہ جس فلسفۂ استبداد کے پرچارک تھے اور ظلم و تعدی کی جس راہ پر گامزن رہے اور اپنے متبعین کو گامزن رہنے کی تلقین کرتے رہے اُس سے کبھی کسی قوم کو فلاح نصیب نہیں ہوئی۔ ماضی میں بھی قوموں کو اس گمراہ کُن فلسفے نے تباہ کیا اور حال میں بھی کئی ممالک اس کی تباہ کاریوں کا نہایت بھیانک نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ خود جسد پاکستان کو اس انسانیت سوز نظریے نے جو چرکے لگائے ہیں اور استبداد کے علمبردار ملک غلام محمد، اسکندر مرزا، ایوب خان، یحییٰ خان اور مجیب جس عبرتناک انجام کو پہنچے ہیں اُس سے کون ناواقف ہے، مگر صد حیف کہ بھٹو صاحب استبداد کے

ہاتھوں پاکستان کی تباہی کے سنگین واقعات اور آمروں کا المناک حشر خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہ کر سکے اور اپنے لیے اُسی ظالمانہ روش کو پسند کیا جو خدا کی رحمت کو نہیں بلکہ اس کے غضب کو دعوت دیتی ہے اور جس کی وجہ سے باری تعالیٰ نافرمان افراد اور قوموں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کیونکہ اس کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ جو بدکردار لوگ دوسروں کے انجام سے عبرت نہیں پکڑتے انہیں خود دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بنا دیا جاتا ہے۔

بھٹو صاحب گو ایک فرد ہیں مگر ان کا آمرانہ طرزِ فکر اور جابرانہ طرزِ عمل ایک مخصوص بیمار ذہن کی غمازی کرتا ہے جسے اَنَا وَلَا غَیرِی کے بلیغ جملے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ جس غیر انسانی روش کو ہم آج استبداد کہتے ہیں اور جس کی قہرمانیوں نے کرۂ ارضی کے بیشتر حصے کو جہنم آسا بنا دیا ہے وہ خود غرضی کی کوکھ سے نمودار ہوتی، خود پسندی کی آغوش میں نشوونما پاتی اور انسان کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت اُسے قوت و توانائی بخشتی ہے اور اس کے تنومند ہونے کے ساتھ ہی دُنیا میں ظلم، ناانصافی اور سفاکی کا دَور دَورہ شروع ہو جاتا ہے۔

لفظ "استبداد" فعل استبد کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں وہ الگ یا بے نیاز ہو گیا یا اُس نے کسی کام یا معاملے میں دوسروں کو شریک بنانے کی ضرورت محسوس نہ کی یا اس نے کسی معاملے میں اس حد تک اختیار حاصل کرنا چاہا کہ کسی دوسرے فرد کی رائے کی پیروی کرنا تو کجا اُسے سُننا تک گوارا نہ ہوا۔ اپنے لیے لوگوں سے ترجیحی سلوک کی آرزو ابتدائی مرحلے میں انسانی خودی کا ایک فطری تقاضا ہے، لیکن اثباتِ خودی کا یہ معصوم سا جذبہ جب اپنی جائز حدود پھلانگ کر خود غرضی کے وسیع میدان میں اپنی جولانیاں دکھانی شروع کرتا ہے تو انسان اپنی فطرت سے انحراف کر کے بگاڑ کی راہ پر بگٹٹ چل نکلتا ہے۔ پھر وہ صرف اثباتِ ذات کا خواہش مند نہیں رہتا، بلکہ اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ اس کائنات میں تنہا اُس کی ذات گرامی ہی کو مرکزی مقام حاصل ہو اور باقی مخلوق اُس کی خدمت اور چاکری کے لیے وقف ہو جائے۔ دوسرے انسان اگر جئیں تو صرف اُس کی حمد و ثنا اور اطاعت گذاری کے لیے، اِس دُنیا کی جو چیز یا جو فرد کائنات کے اِس مرکزی کردار کا یہ مطالبہ ماننے میں ذرا متامل نظر آئے تو اُسے فی الفور نیست و نابود

کر دیا جائے، کیونکہ وہ اُس کے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں حائل ہو کر فطرت کے ملبے جوڑے منصوبوں کو خاک میں ملا رہا ہے۔

یہ ہے مختصر اور سادہ الفاظ میں کسی مستبد کے سوچنے کا نقطۂ آغاز اور نقطۂ انحراف اور اُس کے طرزِ استدلال کا منطقی مغالطہ۔ مگر ظاہر بات ہے کوئی خود پسند شخصیت اپنی اس خود پسندی اور اس کے نتیجہ میں اُبھرنے والے ناپاک عزائم کو عوام کے سامنے واضح طور پر پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی، چنانچہ وہ اپنی بگڑی ہوئی انا کی تسکین کے لیے شیطان کی پیروی میں کچھ ایسی چالیں چلتی اور ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے جو بظاہر بڑے معصوم دکھائی دیتے ہیں، مگر بباطن انتہائی خوفناک ہوتے ہیں۔

لوگوں پر اپنی ذات کو ترجیح دینے کی خواہش جب کچھ زور پکڑتی ہے تو خود پسندی کا روپ دھار کر نمودار ہوتی ہے اور انسان ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جس سے اپنی ذات کے لیے ترفع اور نمائش اور دوسرے کے لیے نفرت اور حقارت کی بو آتی ہے۔ لیکن مستبد اپنے اس ذہنی عارضے کو نہایت چالاکی سے اپنی فکری برتری ثابت کرتا ہے۔ وہ روزمرّہ کے مشاہدہ کی بنا پر عوام کے سامنے یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ چونکہ سب افراد کو فطرت کی طرف سے یکساں صلاحیتیں عطا نہیں ہوئیں، بعض لوگوں کو بہ زیادہ تعداد اور وافر مقدار میں ودیعت کی جاتی ہیں اور بعض کو ان سے کسی قدر محروم رکھا جاتا ہے، اس بنا پر جن افراد کو ان صلاحیتوں کا زیادہ حصّہ ملتا ہے انھیں یہ حق حاصل ہے کہ کم صلاحیت رکھنے والے افراد پر اپنی برتری قائم کریں۔ اُن کا یہ طرزِ استدلال بڑا بودا ہے لیکن وہ اس سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

افراد کے مابین صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ تفاوت فطرت کی کسی غیر عادلانہ تقسیم کا نتیجہ نہیں، بلکہ علیم و حکیم ذات کا حیاتِ اجتماعی کے قیام کے لیے ایک متوازن منصوبہ ہے۔ انسانوں میں خداداد صلاحیتوں کی یکسانی اجتماعی زندگی کے وجود کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے۔ اس لیے رحیم و کریم ذات نے مختلف انسانوں کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے تاکہ بکھرے ہوئے افراد ان صلاحیتوں کی کمی بیشی کی وجہ سے ایک دوسرے کے مددگار بن کر صحت مند معاشرہ کی داغ بیل ڈال سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے اپنے عطیات تقسیم کرنے میں ہر فرد کے ساتھ بڑا فیاضانہ برتاؤ کیا

ہے۔ لیکن تمام افراد کو جو عطیات دیے ہیں اُن کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس بنا پر بعض کوتاہ بین یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے اگر انہیں ذہانت اور فطانت سے نوازا ہے تو اس کا منشا یہ ہے کہ وہ دوسروں پر حکومت کریں اور دوسرے تاحینِ حیات ان کا پانی بھرتے رہیں۔

بہتر صلاحیتوں کے زعم میں عوام پر حقِ حکمرانی کا دعویٰ ممکن ہے بعض افراد کے لیے ذہنی طور پر بڑا دلفریب ہو، مگر اس دعویٰ کو میدانِ عمل میں عوام سے تسلیم کروانا بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ کسی فرد یا گروہ کا اپنے آپ کو صاحبِ صلاحیت سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ ہزاروں افراد اپنی قابلیت اور استعداد کے بارے میں غلط اندازے لگا کر معاشرے سے عجیب و غریب مطالبات کرنے لگتے ہیں، لیکن اُن میں سے بہت کم خوش نصیب ایسے نکلتے ہیں جن کے یہ مطالبات معاشرہ پورے کرنے پر آمادہ ہوتا ہے، خصوصاً سیاسی قیادت و رہنمائی کے میدان میں ایسے لوگوں کا یہ مطالبہ کہ چونکہ وہ فطانت میں دوسرے لوگوں سے برتر ہیں، اس لیے دوسرے افراد برضا و رغبت اُنہیں اپنے اُمور کا والی بنا لیں، مشکل ہی سے پورا ہوتا ہے بلکہ یہی وہ ناجائز مطالبہ ہے جس سے معاشرے میں آویزش شروع ہوتی ہے۔

اپنی برتری کا دعویٰ اور اِس دعویٰ کی بنیاد پر اپنے لیے خصوصی مراعات کا مطالبہ یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں مختلف لاینحل مسائل اور اُلجھنیں پیدا کرتا ہے، لیکن سیاسی میدان کے علاوہ کہیں بھی دہشت گردی کو جنم نہیں دیتا۔ ایک شخص اپنے آپ کو ایک عظیم ادیب یا عظیم شاعر یا عظیم صحافی یا وسیع معلومات رکھنے والا عالم یا بے مثال سائنس دان سمجھتا ہے اور اس بنا پر معاشرے سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نہ صرف اُس کی مناسب عزت افزائی کرے بلکہ اُس کے مرتبہ و مقام کے مطابق اُسے زندگی کی سہولتیں بھی بہم پہنچائے۔ معاشرہ اُس کے اِس دعویٰ کی صداقت معلوم کرنے کے لیے کہ آیا اس کے کارنامے فی الحقیقت اُسی قدر و قیمت کے حامل ہیں جس کا وہ خود مدّعی ہے، اُس کے کارناموں کا جائزہ لیتا ہے، پھر اُن کی قدر و قیمت طے ہو جانے کے بعد صاحبِ صلاحیت فرد کو زندگی کی مراعات بہم پہنچاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ادیب، شاعر، صحافی اور سائنس دان پراپیگنڈہ کے فن میں ماہر ہونے یا انجمنِ ستائشِ باہمی کی برکت سے اپنا قد کاٹھ بڑھانے میں کامیاب ہو جائے اور سوسائٹی میں کوئی ایسا بلند مقام حاصل کرلے جس کا وہ فی الحقیقت مستحق نہ ہو اور اس طرح اُسے اپنے جائز حصے سے زیادہ مراعات حاصل ہو جائیں،

لیکن اُس کا یہ ناپسندیدہ طرزِ عمل معاشرے میں سفاکی اور زیردست آزاری کی عملداری قائم نہیں کرتا کیونکہ تفوق اور برتری کا دعویدار پندارِ نفس کے باوجود اپنے کسی مطالبہ کو جبر و تشدد سے منوا نہیں سکتا۔ معاشرہ اُسے جو مراعات دیتا ہے برضا و رغبت دیتا ہے۔

سیاسی زندگی میں البتہ یہ صورت یکسر تبدیل ہو کر سامنے آتی ہے۔ یہاں جس شخص کے ذہن میں یہ سودا سماتا ہے کہ وہ اَبنائے جنس کے مقابلے میں زیادہ ذہین و فطین ہے، اُس کے دل میں یہ اُمنگ بھی ضرور انگڑائی لیتی ہے کہ اُسے دوسرے افراد پر لازمی طور پر حکومت بھی کرنی چاہیے تاکہ وہ اپنی برتر ذہنی استعداد کے بل بوتے پر معاشرہ کے مسائل کو بہتر انداز میں حل کر سکے۔ مگر یہاں دقت یہ پیش آتی ہے کہ عوام اُس کے دعوے کو آسانی سے ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ کوئی فلسفی، شاعر، ادیب یا سائنس دان نہیں ہوتا کہ نقاد از خود اُس کے فکر و فن یا اُس کے انکشافات کی قدر و قیمت متعین کر کے معاشرے میں اُسے اُس کا صحیح مقام دلوا سکیں۔ چنانچہ ایک سیاست دان جب کسی معاشرے میں اپنی برتری کا دعوٰی لے کر اُٹھتا ہے تو وہ اپنے اس دعوے کی صداقت تسلیم کروانے کے لیے معاشرے کے اصحابِ بصیرت کی طرف رجوع نہیں کرتا بلکہ عوام کو اپنی شخصیت کے افسوں میں گرفتار کرنے کے لیے عجیب و غریب حرکات کرتا اور دلچسپ چالیں چلتا ہے۔ اس کی تگ و تاز کا مقصد چونکہ یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کو کسی نہ کسی طرح اپنے فوق البشر ہونے کا یقین دلا یا جائے اس لیے وہ اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں کے بارے میں عوام کے اندر حیرت انگیز افسانے پھیلا کر انہیں باور کراتا ہے کہ خدا کا اُن پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اُس نے انہیں غیر معمولی صلاحیتوں اور ملکوتی صفات رکھنے والا ایک بے مثال قائد دے دیا ہے۔ اُنہیں اِس نعمت کی پوری پوری قدر کرنی چاہیے اور اُسے جلد از جلد اپنے سیاہ و سپید کا مالک بنا کر یہ موقع فراہم کرنا چاہیے کہ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اُن کی بگڑی بنانے میں مصروف ہو جائے۔ اپنی شخصیت کا طلسم قائم کرنے کے لیے ایک عیّار سیاستدان عوام کے اندر یہ گمراہ کُن تاثر پھیلانے کی بھی پوری کوشش کرتا ہے کہ اُس کی سربراہی عوام کے سارے دکھوں کا مداوا ہے، اُن کی ترقی اور خوشحالی کی واحد ضمانت ہے، اندرونی اور بیرونی خطرات کے مقابلے میں ایک زبردست ڈھال ہے۔ وہ اگر مصائب اور پریشانیوں سے محفوظ رہ کر امن و امان اور عزت و آبرو کی زندگی گذارنے کے متمنی ہیں تو اِن کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ

خوش دلی کے ساتھ آنکھیں بند کر کے اپنے گلے میں فوق البشر کی غلامی کا طوق ڈال لیں اور اگر انہوں نے ایسا کرنے سے گریز کیا تو پھر آسمان اپنی ساری آفتوں کے ساتھ اُن پر ٹوٹ پڑے گا اور زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود اُن پر تنگ ہو جائے گی اور اس کائنات میں کوئی اُن کا پرسانِ حال نہ ہوگا۔ دُنیا کا ہر آمر مستبد اور جابر جھوٹے پراپیگنڈے کی مدد سے اپنے حق میں اسی قسم کے گمراہ کُن تاثرات پھیلاتا ہے اور عوام کو ذہنی طور پر اس بات پر تیار کرتا ہے کہ وہ اس کی سیادت اور حکمرانی کو ایک انتہائی ناگزیر امر سمجھ کر بمسرت تمام قبول کر لیں۔

ظاہر بات ہے کہ کسی فرد کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں اس قسم کے غلط تاثرات بٹھانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس بنا پر دنیا کا ہر آمر اپنے ذاتی، جماعتی اور قومی وسائل کا بیشتر حصہ بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے حق میں پراپیگنڈے پر صرف کرتا ہے تاکہ معاشرے میں اُس کی شخصیت کا نقش اس حد تک نمایاں ہو کہ لوگوں کے ذہن اُس ایک شخصیت کے علاوہ کسی دوسری ذات کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں۔ کسی شخصیت کے بارے میں جھوٹے طلسمات کا تانا بانا، دجل و فریب، کذب و دروغ گوئی ہی سے تیار ہوتا ہے۔ اس لیے ہر آمر عیاری اور مکاری اور پراپیگنڈے کے فن میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ وہ کوئی کام خلوصِ نیت سے نہیں کرتا، بلکہ اُسے ہمیشہ یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ عوام کے اندر اس کی ایسی کارروائیوں کا چرچا ہوتا رہے جن سے عوام کو اُس کے فوق البشر ہونے کا یقین آجائے۔ چنانچہ مستبد اور آمر ٹھوس اور دُور رس نتائج پیدا کرنے والے ایسے اقدامات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جو پراپیگنڈے کے نقطۂ نظر سے اُن کے لیے غیر مفید ہوں۔ بلکہ معاشرے کو ایسے کاموں میں مصروف رہنے کا تاثر دیتے ہیں جو نمائشی ہونے کی وجہ سے عوام کے لیے جاذبِ نظر ہوں اور اخبارات کی شہ سرخیاں بن سکیں۔

جس طرح کوئی شخص صرف ہوا پر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح کوئی معاشرہ حکمرانوں کی محض لن ترانیوں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ حقائق بہرحال حقائق ہی ہوتے ہیں اور انہیں آمروں کی لاف و گزاف سے بدلا نہیں جا سکتا۔ بلند بانگ دعوے آخر عمل کی کمی کو کس طرح پورا کر سکتے ہیں؟ چنانچہ ان دعووں کی حقیقت جلد ہی کھُل کر عوام کے سامنے آجاتی ہے اور وہ حیران ہو کر پوچھتے ہیں کہ اگر ملک ان آمروں اور اُن کے مصاحبین

کی زیرِ قیادت برق رفتاری سے ترقی کر رہا ہے تو اس کے باشندوں کے حالات روبہ اصلاح کیوں نہیں ہوتے، دوسرے ممالک کی نظر میں ملک کا وقار کیوں بلند نہیں ہوتا، عوام کے اندر مستحکم معیشت، صاف ستھری سیاست اور امنِ عامہ کی بہتر صورتِ حال کی وجہ سے خود اعتمادی کیوں پیدا نہیں ہوتی اور ان کے اندر کا اضطراب، سکون و اطمینان میں اور عدم تحفظ کا احساس حفاظت و سلامتی میں اور بیزاری، اخوت و مودت میں کیوں تبدیل نہیں ہوتی۔ عوام کے اندر جس نسبت سے یہ احساسِ محرومی بڑھتا ہے اسی تناسب سے مستبد پراپیگنڈے کی مشینری کو تیز تر کرتا ہے، دلفریب نعروں اور دعووں کا کوٹہ بھی بڑھا دیتا ہے اور ہر ایسی چال چلتا ہے جس سے لوگوں پر اس کی شخصیت کا سحر ٹوٹنے نہ پائے۔

تلخ حقائق جب مستبد کی ساری کوششوں کے علی الرغم تیزی کے ساتھ عوام کے سامنے آتے ہیں اور ان سے اغماض برتنا کسی طور ممکن نہیں رہتا تو پھر آمر ان حضرات کو ٹھکانے لگانے کی فکر کرتا ہے جو اس کے نزدیک عوام کو اصل حقائق سے آگاہ کر کے انہیں بیدار کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں، بالکل اسی طرح کوئی مستبد اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص یا طبقہ عوام کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ اس لیے جب بھی وہ کسی سمت سے اس طرح کا کوئی خطرہ محسوس کرتا ہے تو پہلے مرحلہ پر وہ اس کی کردارکشی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے تاکہ افقِ سیاست پر ابھرنے والے شخص کی سیرت داغدار دکھائی دے اور اس کا روشن چہرہ عوام کو یکسر تاریک نظر آئے۔

کردارکشی کا یہ مکروہ دھندا اگرچہ ہر آمر کا دل پسند اور محبوب مشغلہ ہوتا ہے، اور وہ اسے آخری لمحہ تک جاری رکھتا ہے لیکن تھوڑی مدت کے بعد ہی عوام کے اندر اس کے اثرات زائل ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور ان پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ حکمران اپنے چہروں کی سیاہی چھپانے کے لیے دوسروں کے روشن و تابندہ چہروں پر کالک مل رہے ہیں اور یہ سب جھوٹ، فریب، صریح ظلم اور ناانصافی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر آمر کی جھنجھلاہٹ اپنی آخری حد کو پہنچتی ہے اور جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کا سارا پراپیگنڈا بیکار ثابت ہو رہا ہے اور اس کی ساری معاندانہ کارروائیوں کے باوجود (باقی برصفحہ ۴۸)

دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط
(ایک آیت کی روشنی میں)

از جناب نعیم صدیقی صاحب

اوائل ۱۹۷۶ء کی بات ہے کہ منصورہ سے حکم ملا کہ اپنے آپ کو اس غرض کے لیے تیار رکھو کہ شاید اسلامی دعوت کانفرنس میں جسے مدینہ یونیورسٹی سعودی عرب نے بلایا تھا تمہیں شریک ہونا پڑے۔ اس "شاید" کے سامنے یہ "باید" نمودار ہوا کہ ایک مضمون کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے تیار رکھنا چاہیے۔ چند دن کی سوچ بچار کے بعد مبحث کو مختصر رکھنے کے لیے ایک صورت نکالی۔ بہ عجلت مضمون لکھا اور اس کے انگریزی، عربی تراجم کرانے کے لیے تگ و دو شروع کی۔ کانفرنس کا وقت قریب آجانے پر جب دیکھا کہ نہ دعوت نامہ، نہ ویزا، نہ ٹکٹ ۔۔۔ تو سمجھ لیا کہ پیش نظر امکان باقی نہیں ہے۔ مگر مضمون بہرحال باقی رہا۔ سو وہ پیش خدمت ہے۔ اس کا تمہیدی و اختتامی حصہ غماز ہے کہ یہ مضمون کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے تھا۔

اکابر و اعاظم! اخوان و اعوان!

آپ سب پر سلام و رحمت میری طرف سے بھی، میرے دینی بزرگوں اور رفیقوں کی طرف سے بھی، اور پاکستان بھر کی ملتِ اسلامیہ کی طرف سے بھی!

تمہیدی گذارشات نبیٔ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے ابتدائی سیزدہ سالہ دورِ دعوت و ابتلاء کو کامیابی سے گزار کر مدینہ میں اسلامی نظام کے عہدِ غلبہ و اقامت کا آغاز ۱ھ سے کیا تھا۔ تاریخ انسانی کا ایک نیا زریں عہد شروع کرنے کے لیے ہجرت نے جو زمانی خط کھینچا تھا، اس واقعہ کو جلد ہی چودہ صدیاں پوری ہونے والی ہیں۔ اس دوران میں مسلمانوں پر اقبال و ادبار، ترقی اور زوال، پیش قدمی اور پسپائی، کامیابی اور ناکامی، آزادی اور غلامی، امن اور جنگ، فلاکت اور خوش حالی کے مختلف ادوار آکے گزرتے رہے۔

لیکن اب جبکہ جلد ہی ہم چودھویں صدی ہجری کی منزل سے نکل کر ۱۵ ویں صدی ہجری کا آغاز کرنے والے ہیں، آثار و قرائن گواہی دیتے ہیں کہ یہ صدی انشاء اللہ غلبۂ اسلام اور صلاح و فلاحِ ملت کا ایک باب ہوگی۔

میرے اندر یہ اُمید دو شواہد سے پیدا ہوتی ہے:

اوّلاً یہ کہ مغرب کی ملحدانہ اور مادہ پرستانہ تہذیب جن نظریات و تحریکات کے ساتھ نمودار ہوئی تھی وہ خاصے لمبے دَورِ تجربہ سے گذر کر ناکامی کی حد کو پہنچ رہے ہیں۔ علمی، فنی، تنظیمی، معاشی اور دماغی ترقیات کے باوجود انسانی زندگی کا بحران بڑھتا جا رہا ہے۔ اقوام اور طبقوں اور نسلوں اور مختلف علاقوں اور عالمی بلاکوں کے مابین تصادم اور فساد مختلف شکلوں میں نمایاں ہے۔ خواہشات نے آدمی کو سواری کا جانور بنا لیا ہے۔ وہ دولت کا خادم اور مشین کا غلام ہے۔ سیاست، معیشت اور معاشرت میں ایسی طاقتیں نفوذ کیے ہوئے ہیں کہ فرد ہر نظام میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ چاروں طرف خوف، حزن اور یاس کے سایے گھرے ہوتے جا رہے ہیں۔ جدید انسان کو اس کے خود پیدا کردہ جہنم سے نجات دلانے کے لیے اب کوئی قوت سوائے اسلام کے باقی نہیں ہے۔ پس یہ وقت ہے کہ اگر احیائے اسلام کی تحریکات کی تائید میں مسلم حکمران اور عوام دعوتِ اسلامی کا پرچم لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے عمل و کردار سے دینِ خدا و مصطفےٰؐ کی حقانیت کی گواہی دیں تو پھر بالفاظ اقبال یہ کہنے کا مقام آسکتا ہے کہ ؎

بہ صدائے دردمندے، بہ نوائے دلپذیرے
خُمِ زندگی کشا دم، بہ جہانِ تشنہ میرے

کاش کہ ہم کروڑوں پیاسوں کے جام ہائے تہی میں وہ مشروبِ کوثر انڈیل سکیں جسے بہ ضرورت مند زہر ہلاہل سمجھے بیٹھے ہیں۔

میری دوسری بنائے امید یہ ہے کہ تاریخ کے ہر گذشتہ دَور میں احیائے اسلام کی جو بابرکت تحریکیں مسلمانوں میں اُٹھتی رہی ہیں، ان کے نتیجے میں عملاً مکمل کامیاب انقلاب برپا نہ ہو سکنے کے باوجود بلکہ زیادہ تر بالکل کچلے جانے کے باوجود مغربی سامراج کے دورِ تاخت میں اسلام دشمن غاصب قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلم معاشروں میں سے بڑی جاندار شخصیتیں اور تنظیمیں اور تحریکیں نمودار ہوئی ہیں جنہوں نے مستقبل کے لیے اپنی قربانیوں کے قلوب و اذہان میں از سرِ نو حق کے بیج بو دیے ہیں۔ آخر میں جب ہم چودھویں صدی کی تحریکات کو دیکھتے ہیں

تو یہ منظر سامنے آتا ہے کہ عالمِ اسلام کے ہر گوشے سے پے در پے ایسی تحریکات اُٹھی ہیں جن کا مقصد دعوتِ اسلامی کا فروغ، اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلامی انقلاب کو روبعمل لانا ہے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا سے، ترکیہ اور مصر وسوڈان سے، پاکستان اور بنگلہ دیش سے اور خود سرزمین حجاز سے دعوت حق کے علمبردار اُٹھ رہے ہیں اور مصائب کا سامنا ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان تحریکوں کے مجموعی عمل سے امریکہ برطانیہ، یورپ، افریقہ اور جاپان میں بھی دعوتِ حق کی صدائے بازگشت سنی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں مجھے بے حد مسرت ہے کہ رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے برکت یافتہ سرزمینِ حجاز میں دعوت اسلامی کے پرچم کو بلند تر کرنے کے لیے کام ہو رہا ہے۔ شاہ فیصل کے ہاتھوں یہیں سے تحریک اتحاد اسلامی اُٹھی۔ یہاں مدینہ یونیورسٹی اور رابطہ عالم اسلامی جیسے ادارے قائم ہوئے۔ پھر بنکنگ بلاسود اور اسلامی نیوز ایجنسی اور اسلامی سیکرٹری ایٹ کی تاسیس کی گئی۔ اسی سرزمین پر اسلامی اقتصادیات کانفرنس، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کانفرنس، فقہ کانفرنس اور موجودہ دعوت اسلامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ گذشتہ سال لندن کی عظیم الشان اسلامی کانفرنس کے انعقاد میں بھی کار پردازانِ نجد و حجاز کا بڑا حصہ ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ مختلف مسلم حکومتوں کے سربراہ اور زعمائدین اگر نوجوان قوموں کے ساتھ مل جل کر اسلام کے فروغ کے لیے کام کریں تو منزلِ مطلوب جلد سر ہوسکتی ہے۔

غیر اسلامی دنیا، اور اسلامی دنیا کی دو مذکرہ علامات کو سامنے رکھ کر میں اللہ سے یہ اُمید کرتا ہوں کہ پندرھویں صدی ہجری ہماری نشأۃ نو کی صدی ہوگی۔ (انشاء اللہ)

ان تمہیدی گذارشات کے بعد میں اپنے تجویز کردہ عنوان کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

اسلام میں دعوت کی اہمیت ایمان باللہ اور اطاعت للہ کے ساتھ دعوت الی اللہ کو لازم کیا گیا ہے۔ دعوت الی اللہ کا ہدف بالفاظ حضرت مُغیرہ بن شعبہ "اِخْرَاجُ الْعِبَادِ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ اِلٰی عِبَادَةِ اللّٰہِ" ہے[1] یعنی بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں لانا۔ اس کا تکمیلی نتیجہ اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ تمام انبیائے کرام (علیہم السلام) ایک ہی دعوت کے علمبردار تھے جیسے کہ قرآن صراحت کرتا ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (النحل ۳۶) فرمایا کہ ہم نے

---

[1] البدایہ والنہایہ - ج ۷، ص ۳۹۔

ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ (لوگو) اللہ کی عبادت کرو۔ حضور داعیاً الی اللہ (الاحزاب ۴۶) بن کر اُٹھے تو مسلمانوں کو وحی الٰہی کے مطابق امتِ وسط قرار دے کر شہادۃ علی الناس کا فریضہ سونپا گیا (البقرہ: ۱۴۳) مقصدِ دعوت (جس کی تکمیلی منزل جہاد بھی ہے) کے لیے ان کو پکارا: کونوا انصار اللہ (الصف: ۱۴) کہ اُٹھو اور اللہ کے کام میں مددگار بنو۔ کہیں بات دوسرے الفاظ میں کہی: تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر) ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرو، اور (اس راہ میں جو کچھ پیش آئے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے) آپس میں صبر کی تلقین کرو۔ (سورۂ عصر: ۳) - ایک اصطلاح اور بھی قرآن میں استعمال ہوئی ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۰۴) ضرورت ایک ایسی امت کی بتائی گئی جو بھلائی کی دعوت دے، نیکی (کو پھیلانے) کے لیے حکم کرے، اور بُرائی سے روکے۔ تلقینِ حق، یا بھلائی کی دعوت اور نیکی کا حکم اور بدی کا انسداد اسی کارِ عظیم کی تعبیر و تفصیل ہے جسے ہم دعوتِ اسلامی کے عنوان سے لے رہے ہیں۔

ایک حدیث میں حضورؐ نے بنی اسرائیل کی خرابیٔ احوال کا ذکر کر کے نہایت شدت سے کارِ دعوت کی تاکید فرمائی:-

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَاْخُذُنَّ عَلٰى يَدِ يِ الظَّالِمِ وَلَتَاْطُرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا اَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ۔ (روایت ابن مسعودؓ مندرج بیہقی و مشکوٰۃ)	اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا اور بُرائیوں سے (لوگوں کو) روکنا ہوگا، اور نہیں ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے حق کے سامنے جھکانا ہوگا ورنہ تم سب کے دل بھی ایک ہی طرح کے ہو جائیں گے[1] (یعنی بُرائی کا رنگ سب پر چڑھ جائے گا)۔ پھر اللہ تعالیٰ تم کو بھی اسی طرح اپنی رحمت و مغفرت سے دُور کر دے گا جیسے اُس نے انہیں (بنی اسرائیل کو) کیا تھا۔

---

[1] یہ مفہوم بھی غالباً ہو سکتا ہے کہ تمہارے قلوب آپس میں ٹکرا کر پھوٹ میں پڑ جائیں گے۔

یہاں اس بحث کو اٹھانے کا موقع نہیں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہدف مقصود یہ ہے کہ اہلِ حق کو اتنی قوت حاصل ہو جائے کہ وہ ظالم کو دستِ ظلم کو روک سکیں اور اُسے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیں۔ البتہ یہ امر واضح ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی عدم ادائیگی خدا کی رحمت سے محرومی کا باعث ہو سکتی ہے۔ یعنی دعوت الی اللہ، اور دعوت برائے اعلائے کلمۃ اللہ ذریعہ حصولِ رحمت ہے۔

بس کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جو دعوتِ اسلامی میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق حصہ لیے بغیر خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کا حق ادا کر سکے، اور جس پر ہمہ وقتی ڈیوٹی عاید نہ ہو۔

سورہ النحل کی آخری آیات

دعوتِ اسلامی وہ فریضۂ محکم اور سنتِ قائمہ ہے جس کے لیے قرآن میں کئی مقامات پر ہدایات دی گئی ہیں۔ مگر ایک مقام ایسا ملے گا کہ جہاں دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط مختصراً یکجا ملتے ہیں۔ قرآن کے اس مقام کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت ہرم ابنِ حیان پر جب آخری وقت آیا تو لوگوں نے وصیت کے لیے تقاضا کیا۔ حضرت ہرم نے جواب دیا کہ میرے پاس مال و جائداد تو ہے نہیں کہ اس کے بارے میں وصیت کروں، میری وصیت ہے تو بس یہ کہ سورۃ النحل کی آخری آیات کی پاسداری کی جائے۔ چنانچہ میری نگاہ قرآن کے اس مقام پر مرتکز ہوئی۔ یہ آیات چار ہیں (۱۲۵ تا ۱۲۸)۔ ان میں دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط مذکور ہیں ان کو میں الگ الگ عرض کرتا ہوں۔

اسلام اور توسیعِ دعوت

سب سے پہلے اُدْعُ کا امر ہمارے سامنے آتا ہے، مگر اس پر بات کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ دنیا میں بعض مذہبی نظام ایسے ہیں کہ جن کی فطرت تبلیغی نہیں ہے۔ کچھ تحریف زدہ مذہبی اجزا، کچھ غیر عقلی عقیدے اور کچھ خاص طرح کے اخلاقی تصورات ایک نسلی عصبیت کی فصیل سے گھر جاتے ہیں۔ ایسے مذاہب کا چلن زیادہ تر ان کو اختیار کرنے والے گروہ کی اگلی نسل میں، اور پھر اس سے اگلی نسل میں ہوتا رہا ہے۔ بسا اوقات تو نسلی نسبت کی طرح ایک مذہبی نسبت باقی رہ جاتی ہے۔ جو تھوڑے سے بہت حقیقت کے اجزا مذہب میں شامل ہوتے ہیں وہ بھی پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ نسلیت کی فصیل کے اندر نسلی مذہب کی کتنی ہی متفرق و متضاد تعبیریں پیدا ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ انکارِ خدا، اور نفی اعتقادات اور ترکِ اخلاق تک بھی نوبت پہنچتی ہے، اور بالعموم عملی زندگیوں کی نشو و نما آزادانہ صورت میں ہوتی ہے۔ لیکن جو فصیل کے اندر ہے اور اندر پیدا ہوا وہ بہرحال اپنی مخصوص نسل کی طرح اپنے مخصوص مذہب سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔

دراصل ایک مضبوط معاشرتی وحدت ایسی پیدا ہو جاتی ہے جس کے جال سے کوئی نکل نہیں سکتا۔ ایسے مذاہب میں نہ انسانیت کے لیے اپیل ہوتی ہے اور نہ دعوت کے فروغ کا اہتمام ہوتا ہے۔ بلکہ نصیل سے باہر کے لوگوں کو پیدائشی طور پر ناپاک اور پست اور ذلیل سمجھا جاتا ہے اور ان سے نفرت کی جاتی ہے۔ اگر کسی زور آور قوت سے سابقہ پڑے تو خوشامد کے پردے میں اس کے خلاف سازش کی جائے گی اور اگر کوئی کمزور زد میں آئے تو اول تو اُسے ظلم اور تشدد کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا جائے گا، ورنہ اُسے معاشرے کی سب سے نچلی سطح پر رکھ کر مظلومی اور محرومی کی مختلف شکلوں سے دوچار کیا جائے گا۔ اس کی مثال میں یہود اور ہنود کے مذاہب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اسلام سچا، الہامی اور عقلی دین ہے اور پوری زندگی کے لیے صلاح و فلاح کا پیغام ہے۔ لہٰذا وہ ساری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ کسی خاص نسل یا وطن کے لیے خاص نہیں ہے اور نہ نسلیت اور وطنیت کے ساتھ گندھا ہوا ہے۔

اُدْعُ میں توسیعِ دعوت کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظام تمام انسانوں سے محبت کرنے والا اور تمام انسانوں کی خیر خواہی کا علمبردار ہے۔ اسے نسل و وطن اور مروجہ مذاہب اور معاشرتی نظاموں کی وجہ سے کسی سے ایسی نفرت نہیں ہے کہ وہ انہیں دعوت کا مخاطب نہ بنائے اور دعوت قبول کرنے پر اپنی محفل کے شرکاء کے ساتھ برابر کی جگہ نہ دے۔ یہ کلمہ اُدْعُ ان تمام مصنوعی تقسیموں کی نفی اپنے اندر مضمر رکھتا ہے جن کی کھڑی کی ہوئی دیواروں میں انسانیت تقسیم ہو گئی ہے اور اس تقسیم سے پیدا ہونے والے تمام گروہ ایک دوسرے کے معاند ہیں۔

حکمِ اُدْعُ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ خدا کا دین ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک فرد اس پر ایمان لا کر، اور اپنی ذات کی حد تک چند عقیدے اور چند عبادات اور چند اخلاقیات کو اختیار کر کے یہ سمجھ لے کہ اس کا کام پورا ہو گیا ہے اور دوسروں کے متعلق اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، جیسا کہ سورۃ المائدہ کی آیت (۱۰۵) "عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ" سے نزولِ آیت کے وقت بعض صحابہ کو وقتی طور پر غلط فہمی ہوئی تھی۔ کوئی مسلمان یوں نہیں سوچ سکتا کہ اس کا خاندان، اس کا معاشرہ، اس کا ملک اور ملک کا نظامِ فرمانروائی، اور چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا جس بگاڑ میں چاہے مبتلا ہوتی رہے، اس کی بلا سے۔ اس کے وجود کے اردگرد جس بھی عقیدہ و مسلک کے لوگ نظامِ ریاست و معیشت، نظامِ معاشرت و تمدن، نظامِ اخلاق و افکار اور

نظامِ تعلیم و ثقافت کو جیسی بھی شکل میں چاہیں چلاتے رہیں، وہ بری الذمہ ہے۔ نہیں بلکہ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ دوسروں تک دعوت پہنچائے، ان کے قلوب و اذہان اور عادات و اطوار کو تبدیل کرنے کی کوشش کرے۔ یہاں تک کہ کوئی طاغوتی نظام اور اس کی فاسد قیادت برقرار نہ رہ سکے۔

اُدْعُ کا اشارہ یہ بھی ہے کہ خدا کا دین سمٹ کر رہنے کے لیے نہیں، پھیلنے کے لیے آیا ہے۔ افراد کی نجی زندگیوں میں دبکا رہنے کے لیے نہیں، بلکہ ہیئت اجتماعیہ پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔ وہ انفرادی مذہب نہیں، اجتماعی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں پر دعوت کی ذمہ داری پوری اہمیت سے ڈالی ہے۔ اسلامی دعوت بعض دوسرے مذاہب کے پرچار اور پرچنگ کی طرح ایک محدود اور سرسری مشغلہ نہیں ہے[1]۔

پیشِ نظر رہے کہ انسانی تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ دنیا میں صرف وہی عقیدے، مسلک اور نظام غالب ہوسکے یا کم از کم کسی شکل یا درجے میں باقی ہی رہ سکے، جن کے ماننے والوں نے دوسروں تک دعوت پھیلائی۔ کسی عقیدہ و مسلک کو انسان خود اپنے اندر بھی تسلسلِ دعوت کے بغیر برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اسلام نے بھی اگر فروغ حاصل کیا اور غالب ہوا تو یہ نتیجہ تھا دعوتِ اسلامی کی راہ میں اس مجاہدۂ عظیم کا جس کا حق اوّلاً رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابہ کبارؓ نے، اور بعد کے ائمہ ہدیٰ اور دعاۃِ حق اور ان کے قائم کردہ اداروں اور تنظیموں نے زبان و قلم کی حرکت اور جان و مال کی قربانیوں سے ادا کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم مسلمان ایک بڑی تعداد میں چودہ صدیوں سے کرۂ ارض پر موجود ہیں۔ آج ہماری کمزوری کا سبب یہ ہے کہ ہم نے بحیثیتِ امت مجتمعاً شہادت علی الناس کا فریضہ کما حقہ ادا نہیں کیا، بلکہ محض کچھ عزیمت مند افراد اور چھوٹے چھوٹے ادارے دعوت کا تسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے اس محدود کارِ دعوت کو بھی

---

[1] اس کے لیے بدیہی حکم دینے کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث میں اس کے لیے مؤثر حکیمانہ طریقِ کار کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ دعوت دینے والوں کے لیے ایک اخلاقی معیار مقرر کیا گیا ہے اور دعوت سے لوگوں کے قلوب کے مفتوح ہونے نہ ہونے کی دونوں صورتوں کے لیے داعیان کا موقف متعین کیا گیا ہے، یعنی اسلام میں دعوت کا ایک مستقل ضابطہ اور لائحہ عمل ہے، جس طرح دوسرے دینی مقاصد کے لیے تفصیلی نقشے دیے گئے ہیں۔

ہماری عملی زندگیوں کا تضاد پنپنے نہیں دیتا۔ آج کا باطل کا جہاں گیر سیلاب اتنا تند و تیز ہے کہ اچھے اچھے پرجوش خادمانِ اسلام کے لیے اپنے ایمان اور اپنی اخلاقی قدروں کو بچانا مشکل ہو رہا ہے۔ اور اگر کچھ لوگ اپنا بچاؤ کسی قدر کر بھی لیں تو اُن کی خواتینِ خانہ اور ان کی اولادوں کو مادہ پرستی کے عفریت ان کی آنکھوں کے سامنے ہڑپ کرتے جا رہے ہیں۔ اس طوفانِ دوراں میں صرف دعوتِ اسلامی ہی کشتیٔ نوحؑ بن کر ہمیں تباہی سے بچا سکتی ہے۔

اُدْعُ کی تعمیل تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ داعی ایک طرف تو یہ جانتا ہو کہ وہ کس مسلک اور نظام کی دعوت دے رہا ہے، دوسری طرف یہ بھی اس پر واضح ہو کہ اس کے اختیار کردہ حق کے بالمقابل باطل کن کن شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ دعوت تو وہ جبھی دے گا اور جبھی وہ مؤثر ہو گی جبکہ اسلامی اصول و مقاصد پر اس کا دل ٹھک جائے اور وہ اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال رہا ہو۔ دوسرے پہلو سے غیر اسلامی نظریات و تحریکات کے باطل ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں اُن سے اجتناب کرنے اور اُن کے اثرات کی مزاحمت کرنے کا جذبہ موجود ہو۔ اسلامی دعوت کی راہ میں ایسے مسلمان کوئی مؤثر حصہ ادا نہیں کر سکتے جو نہ حق کا حق ہونا سمجھتے اور اپنی زندگیوں کو اس کے حوالے کرتے ہوں، اور نہ باطل کو باطل مان کر اس سے اپنے افکار و کردار کو محفوظ رکھنا چاہتے ہوں۔ غفلت زدہ قلوب، دھندلے تصورات، تذبذب و تامّل کی کیفیات اور عملی تضادات کے ساتھ اسلامی دعوت کا فریضہ انجام دینا ممکن نہیں۔

یہاں تو عالم یہ ہو گیا ہے کہ مسلم معاشروں میں سے جو لوگ دعوتِ اسلامی کی علمبرداری کے لیے اُٹھتے ہیں، اُن کے لیے مشکلات پیدا کرنے، انہیں اُلجھانے، انہیں پریشان کرنے بلکہ تشدد و تعذیب کا نشانہ بنانے کے لیے خود وابستگانِ اسلام ہی میدان میں آتے ہیں۔ ایسے وابستگانِ اسلام نے کتنی ہی اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کو کچلا۔ کتنے ہی صلیب کی جانیں لیں، کتنوں کو قید و بند میں ڈالا اور کتنوں کو معاشی مصائب کے حوالے کر دیا۔

یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ ان سنگین اور نامعقول حالات کے باوجود اسلامی دعوت نے خود مسلم معاشروں میں بھی اور غیر مسلم دنیا میں بھی پیش قدمی کی ہے۔ اور روز بروز دعوتِ اسلامی کی لہر اونچی اُٹھ رہی ہے۔

سبیلِ ربّ کی دعوت

اُدْعُ کے ساتھ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ کے الفاظ دعوت کا رُخ اور ہدف متعین کرتے ہیں۔ "سبیل" کا لفظ حرکت و اقدام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کچھ خطوط ہیں جن پر عملاً آگے بڑھنے کی

دعوت دی جاتی ہے۔ یہ لفظ جامد مذہبیت کی نفی کرتا ہے۔ دعوت کا مقصود جادۂ ہدایت کو سامنے لانا ہے جس پہ افراد اور اقوام کے قافلے زندگی کا سفر سلامتی سے طے کر سکیں۔

اِلیٰ سبیل ربک کا منشا یہ بھی ہے کہ دعوت سبیلِ رب کی طرف دی جائے گی۔ اپنی کسی من گھڑت بات یا ایجاد کردہ یا مستعار لیے ہوئے پروگرام کی طرف نہیں۔ ربِ واحد کو چھوڑ کر، یا اس کے ساتھ کسی خاص شخص یا قوم یا خاندان یا نسل کی دعوت دینا مطلوب نہیں ہے۔ نہ کسی طبقے یا فرقے کو مقصود بنایا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ سبیل رب کے ساتھ فاسد تاویلات، من گھڑت بدعات اور رسوم و قیود کی جو آلائشیں جمع ہو گئی ہوں، داعی انہیں الگ کر کے، اصل دین کو نکھار اور نکھار کر پیش کرے۔ ہماری پچھلی تاریخ میں خاندانوں کی نزاعات، اقتدار کی رسہ کشی، مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑا دینے اور ملت کو پھاڑ دینے والے جو اختلافات اور طبقوں اور نسلوں کے درمیان جو سازشیں نمودار ہوتی رہی ہیں ان سب کے زیر اثر دین کے تصورات مسخ ہوتے ہیں اور ایک شاخ در شاخ تفرقہ نمودار ہوا ہے۔ اسی طرح ایک دور میں عجمی ثقافت و تمدن اور اس کے ساتھ ہندی تصوف و تفلسف، پھر ایک دور میں یونان کے الٰہیاتی اور سیاسی فلسفہ و منطق، اسی طرح ایک دور میں تفسیری لٹریچر میں اسرائیلیات، اور اب بعد کے دور میں مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کے نظریات و علوم ہمارے دینی تصورات میں اس طرح سرایت کرتے رہے جس طرح زہر زخم میں پھیلتا ہے۔ گذشتہ اور موجودہ دور کے ان بیرونی اثرات سے جو چیزیں دین اور دینی فکر میں داخل ہوتی ہیں ان کو الگ کرنا آج کے سچے داعیٔ اسلام کے لیے ضروری ہے۔

سبیلِ رب کے لیے دعوت کو مخصوص کرنے کا یہ تقاضا بھی واضح ہے کہ داعیانِ حق کو ہر قسم کی جاہلی عصبیتوں اور سان کی بنا پر کھڑی ہونے والی جانب داریوں اور تفرقوں سے بھی نجات حاصل کرنی چاہیے۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں کتنی سخت بات فرمائی کہ لَیْسَ مِنَّا مَنْ دَعَیٰ اِلیٰ عَصَبِیَّۃٍ ..... الخ (روایت حضرت جبیر بن مطعم۔ مندرجہ ابی داؤد) ترجمہ: وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جس نے کسی عصبیت کی دعوت دی.....!

شرطِ حکمت خدا کے راستے کی طرف دعوت دینے کا ایک تقاضا یہ ہے کہ اسے (بالحکمۃ) حکمت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ مقصود یہ ہے کہ دعوتِ حق کو اندھے کی لاٹھی کی طرح نہ گھمایا جائے بلکہ بصیرت مندی

سے کام لیا جائے۔ مخاطبین کے ظروف و احوال، ان کے مسائل، ان کے ذہنی اشکالات، ان کی نفسیاتی کیفیات، ان کے جاذب توجہ معاملات اور دعوت حق کو سننے کی آمادگی اور قبول کے رجحانات کا اندازہ کرکے موقع کے لحاظ سے دیکھا جائے کہ کتنی بات کس انداز سے کہنا مناسب ہے۔ جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

إِنَّ لِلْقُلُوبِ شَهَوَاتًا وَإِقْبَالًا وَإِدْبَارًا فَأْتُوهَا مِنْ قِبَلِ شَهَوَاتِهَا۔	انسانی قلوب کچھ خواہشات رکھتے ہیں، اور (ان کی وجہ سے) ان میں کبھی آگے بڑھنے کا میلان ہوتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹنے کا۔ پس ان کی خواہشوں (اور جذباتی کیفیات) کو نگاہ میں رکھ کر ان پر اثر انداز ہونے کا
(کتاب الخراج - ابو یوسف)	راستہ نکالو۔

پھر مخاطبین کی بڑی اقسام ہیں۔ مختلف زمانوں، ملکوں، نسلوں اور طبقوں کے لوگ الگ الگ احوال رکھتے ہیں۔ ان میں مستکبرین بھی ہوتے ہیں اور مستضعفین بھی، مترفین بھی ہوتے ہیں اور مساکین بھی، مثلاً شیانِ حق بھی ہوتے ہیں اور دنیا پرست غافلین بھی، ان میں سنجیدہ شرفاء بھی ہوتے ہیں اور معاندین اور مستہزئین بھی۔ پھر لوگوں میں وہ بھی ہوتے ہیں جو یکسر تارکین مذہب اور الحاد پسند و اباحیت پسند ہوتے ہیں، وہ بھی جو کسی محرف مذہب کے چند ٹوٹے پھوٹے اجزاء کو سینے سے لگائے ہوئے ہوتے ہیں، اور وہ بھی جو اسلام جیسے دین سے نسبت رکھنے کے باوجود نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ عمل، بلکہ اُلٹا بعض جرائم پیشہ ہوتے ہیں، بعض مسلمان ہوتے ہوئے اسلامیت کے خلاف جنگ آزما رہتے ہیں، بعض تفرقہ بازی کے مشغلوں میں لگے رہتے ہیں۔ بعض مذہبی لوگ اسلام اور غیر اسلام کے اجزاء کو خلط ملط کرکے اپنے کردار میں جمع اضداد کرتے ہیں۔ وہ بھی ہوتے ہیں جو غیر اسلامی مشاغل حیات پر اسلام کا لیبل چسپاں کرکے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں بھی مزے کر رہے، اور جنّتِ اُخروی بھی پیشگی الاٹ شدہ ہے۔ غرض کئی طرح کے مریضانِ ضلالت ہیں جن کے لیے طریقِ دعوت کا نسخہ الگ الگ بنانا پڑتا ہے۔

ان مختلف اقسام کے لوگوں سے دنیا بھر میں جو معاشرے تشکیل پاتے ہیں۔ وہ الگ الگ قسم کے تاریخی احوال، سیاسی مدوجزر، اقتصادی عدم توازن اور معاشرتی فساد سے گزر رہے ہوتے ہیں۔

اصولِ حکمت کے تحت داعیِ حق کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ وقت کے مجموعی احوال کی نبضوں پر سے انگلیاں

نہ ہٹائے اور مختلف گروہوں اور طبقوں کی دلچسپیوں اور توجہات کو سمجھے، اور پھر ہر مخاطب فرد کی نفسیاتی و اخلاقی کیفیت کی تشخیص کرے۔ پھر یہ طے کرے کہ کسی گروہ یا مجلس کو مجتمعاً یا کسی فرد کو منفرداً دعوت پہنچانے کا پروگرام کیا ہوگا، اس کی ترتیب کیا ہوگی اور اس کا اسلوب کیا ہوگا۔ نیز وہ عناصر کونسے ہیں جن کو ایک مرحلے پر نظرانداز کر دینا ضروری ہے۔

قرآن کی رُو سے تو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزیں دو ہیں: ایک ہدایت (اصولی حقائق کی تعلیمات اور ضابطہ) اور دوسری حکمت جس کے لیے میزان کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآنی تعلیم یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں جس طرح ضابطے کے نفاذ میں حکمت کا التزام ضروری ہے، اسی طرح دعوت کی توسیع کی مہم میں بھی حکمت سے کام لینا لازم ہے۔ چنانچہ خود قرآن نے مستکبرین، مستضعفین، منکرین، غافلین اور متلاشیانِ حق اور طلبگارانِ حق اور اہلِ نفاق کے نفسیاتی اور عملی خاکے پیش کر کے ہر ایک کے متعلق رہنمائی دی ہے کہ کب کس سے کیا معاملہ کرنا چاہیے۔ پھر احادیث کا خزینۂ ہدایت قرآنی احکام و اشارات کے عملی انطباق کے جو وسیع نمونے ہمارے سامنے رکھتا ہے، وہ اپنی جگہ بے حد حکمت آموز ہیں۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحیح داعیٔ حق وہ ہے جس کی بصیرت اُسے رہنمائی دیتی رہے کہ کہاں صراحت مناسب ہے اور کہاں کنایت سے آغاز کرنا ہے، کہاں تفصیل میں جانا ہے اور کہاں اجمال پہ اکتفا کرنا ہے، کہاں بات براہِ راست کہی جائے اور کہاں پیغام درحدیثِ دیگراں سُنایا جائے، کہاں ترغیب ہو اور کہاں ترہیب، کہاں تبشیر ہو اور کہاں اِنذار، کہاں علمی مباحث چھیڑے جائیں اور کہاں سادہ سہل گفتگو سے کام لیا جائے، کس وقت کتنی بات کی جائے اور آئندہ کتنے کتنے وقفوں سے دعوت دی جائے۔

حکمت کا غلط تصور حکمت کا مفہوم ہمارے ہاں انگریزی لفظ پالیسی کی طرح قدرے بگڑا ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ عوام کے سامنے دین کو من گھڑت، بے سند اور محیر العقول قصّوں سے آراستہ کر کے، اُن کی پسند کے غیر اخلاقی طرزِ کلام سے کام لے کر، لچھے دار تقریروں کے نقرے گنگنا کر اور جلسوں کو سامانِ تفریح بنا کر انھیں بہلایا پھسلایا جائے۔ کہیں منت سماجت، لجاجت اور خوشامد سے اور کہیں کثیر التعداد حامیوں کی دھاک کا رُعب بٹھا کر اور کہیں مناظرں کے اکھاڑے جما کر خدا کے مقدّس دین کی طرف لوگوں کو مائل کیا جائے۔

حکمت لوگوں کو بہکانے اور غلانے کا نام نہیں ہے، اور نہ خدا کے دین کا یہ مقصد ہے کہ لوگ صُمّاً

وَبُكْمًا وَّعُمْيَانًا ہوتے ہوئے دین کی عقیدت کے مظاہرے کریں۔ وہاں تو مطلوب ایمانی شعور کا پیدا کرنا ہے ــــ پڑھے لکھوں میں علمی سطح کا شعور، اور غیر تعلیم یافتہ عوام میں سادہ قسم کا شعورِ حقائق ـ دینی حقائق کا شعور پھیلائے اور خیالات اور اخلاق کی اصلاح کیے بغیر ووٹ تو لیے بھی جا سکتے ہیں، مگر لوگوں سے دین کے مطالبات پورے نہیں کرائے جا سکتے۔

تو دعوتِ حق کا کام جس اخلاص سے ہوتا ہے، وہ کسی تصنع کو گوارا نہیں کرتا کہ داعی بہروپ بھرے اور ایکٹنگ کرے اور لوگوں کو گم سم کر دے۔ دعوتِ حق کا وقار اور داعی کے اخلاص کے شایانِ شان تو یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ وہ مصنوعی موادِ کلام تو کیا مصنوعی اندازِ کلام بھی اختیار کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سخت الفاظ میں گفتگو اور تقریر کے بعض اسالیب سے منع کیا ہے۔ مثلاً فرمایا: هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ غارت ہوئے غلو اور مبالغہ کرنے والے (روایت ابن مسعودؓ - ابوداؤد) پھر فرمایا کہ تم میں سے قیامت کے دن مجھ سے بعید ترین اور میری نگاہ میں مبغوض ترین ثرثارون، المتشدقون اور متفیہقون ہوں گے۔ (روایت حضرت جابر- الترمذی) ان الفاظ سے مراد مختلف اقسام کے وہ لوگ ہیں جو تکلفاً بسیار گوئی کریں، مصنوعی طور پر کلام کو پرشکوہ بنائیں اور لغتِ غریب اور اصطلاحاتِ نامانوس سے سامعین کو مبہوت کریں، تکبر و تفاخر کے جذبے اور اپنے فرمودات کے بلند پایہ ہونے کے زعم کے ساتھ رعب گانٹھیں۔ (باقی)

اسلام کا تصوّرِ تاریخ

عبد الحمید صدیقی

یہ مقالہ بزبانِ انگریزی اسلامی تعلیمی کانفرنس میں پیش کیا گیا جو گذشتہ دنوں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی مکہ معظمہ میں منعقد ہوئی۔ خاکسار اپنی علالت کے باعث خود اس تقریب میں شریک نہ ہو سکا۔ میرے ایک عزیز نے اسے حاضرین کے سامنے پیش کیا۔

قرآن مجید بلاشبہ تاریخ کی کتاب تو نہیں، لیکن یہ تاریخ کے سینے میں محفوظ واقعات کا الہامی محاکمہ ضرور ہے۔ قرآنِ حکیم نے جس معجزانہ انداز میں اقوامِ عالم کی زندگی ——— اُن کے عروج و زوال اور ترقی و تنزل کے مختلف اَدوار اور اُن کے اسباب پر بحث کی ہے، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ اُس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتے۔ یہ محض قرآن مجید کا فیضان تھا کہ انسان کے اندر یہ اُمنگ پیدا ہوئی کہ وہ واقعات کے پسِ پردہ جھانک کر اُن وجوہ کا کھوج لگائے جن کے بطن سے انہوں نے جنم لیا ہے۔ آج نہ صرف تاریخ میں بلکہ علم کے ہر شعبہ میں تحقیق کا یہ انداز اور ہر واقعہ کے بارے میں تجسّس کا یہ اسلوب کہ آخر ایسا کیوں ہوا اور اگر ہوا تو کس طرح ہوا اپنے وجود کے اعتبار سے قرآنِ حکیم کا رہینِ منّت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ذوقِ تجسّس بخت و اتفاق کی ہمہ گیر عملداری کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ جب انسان مختلف واقعات کی تہ میں کار فرما محرکات کی نوعیت دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر بخت و اتفاق کی وہ سحرکاری اور اس کے مقابلے میں انسان کا عجز اور اُس کی بے بسی اور درماندگی باقی نہیں رہتی جو اس تصوّر سے وابستہ ہے۔

اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ جب کوئی شخص تاریخ کا مطالعہ اس مفروضے پر کرتا ہے کہ یہاں جو کچھ موجود ہے وہ بخت و اتفاق کی کرشمہ سازی ہے تو وہ ہر واقعہ اور ہر حادثہ کو ایک الگ اور منفرد اکائی سمجھ کر جائزہ لیتا ہے جس کا دوسرے واقعات اور حوادث کے ساتھ کوئی ربط نہیں

ہوتا۔ یہ غالباً مطالعہ تاریخ کے بارے میں اسی غلط نقطۂ نظر کا نتیجہ تھا کہ ماضی میں انسان نے حالات و واقعات کو تو قلمبند کیا لیکن اُن کے مابین کوئی مقصدی ترتیب قائم کرنے کی کوشش نہ کی۔ یہ قرآن حکیم کا انسانیت پر احسانِ عظیم ہے کہ اس نے امروز و فردا کے حجابات ہٹا کر ماضی کو حال کے لیے مستقل طور پر درسِ عبرت بنا دیا۔ چنانچہ قرآن مجید حالات و واقعات کا محض تذکرہ نہیں، بلکہ ان کی منطقی توجیہ اور عقلی، اخلاقی اور روحانی تعبیر بھی ہے۔ گذرے ہوئے واقعات سے انسان اُسی صورت میں عبرت حاصل کر سکتا ہے جب اُسے یہ حقیقت اچھی طرح سے معلوم ہو کہ قدیم و جدید کی تفریق فقط دلیلِ کم نظری ہے، اور اس کرۂ ارض پر ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کی صورت میں بنی نوع انسان کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کے واقعات حال کے لیے اِس بنا پر درسِ عبرت ہیں کیونکہ اس کائنات میں ایک ہی عالمگیر قانون پوری طرح کارفرما ہے۔ جس طرح قوانینِ فطرت اٹل ہیں اور اُن میں کوئی تغیر ممکن نہیں، اِسی طرح نوع انسانی اور اس کے مسائل بھی غیر متبدل ہیں۔ عہدِ رفتہ میں بسنے والے افراد کے جذبات و احساسات، اُن کے نجی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایسے ہی تھے جیسے کہ ہمارے، کیونکہ انسان کی جسمانی ساخت، اُس کا اخلاقی اور روحانی احساس اور اُس کے نفسیاتی تقاضوں میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے تاریخ کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ قانونِ فطرت کی طرح عالمگیر ہے۔ یہ زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ یہ نظریہ کسی منتخب قوم کی تگ و تاز کے جائزہ تک محدود نہیں بلکہ پوری نوع بشری نے حق و صداقت کے معاملے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کا احاطہ کرتا ہے۔

مزید برآں قرآن و سنّت نے انسان کے کردار کو بحیثیت ایک آزاد عامل، جو بعض حدود کے اندر سرگرمِ عمل ہے، خوب اُجاگر کیا ہے۔ عصرِ جدید کے فلاسفہ اور مورخین نے ان لاشعوری اور غیر شخصی عوامل پر بے جا زور دیا ہے جو معاشرے میں تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں۔ اس بنا پر افکار و مقاصد کی اثر آفرینی کے بارے میں لوگوں کے اندر بے شمار شکوک و شبہات پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ جب انسان یہ فرض کر کے معاشرے کا جائزہ لے کہ خارجی قوتیں خصوصاً پیداآوری قوتیں ہی اُس کی صورت گری میں فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہیں اور معاشرہ اور اس کے افراد زندگی کا وہی نہج اختیار کرنے پر مجبور ہیں جس کا یہ خارجی قوتیں تقاضا کرتی ہیں تو اُس کی نظروں سے لامحالہ کسی اعلیٰ نصب العین کی اہمیت گر جائے گی

بلکہ اس نصب العین کا وجود ہی اُس کی نگاہ میں مشکوک ہو کر رہ جائے گا اور وہ اُسے فریب نظر سمجھ کر اُس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرے گا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دورِ جدید کے دانشوروں نے پاکیزہ افکار و نظریات کی غیر معمولی اہمیت اور ارفع نصب العین کے وسیع اور عمیق اثرات کا ادراک نہیں کیا، اِس لیے وہ اپنی صلاحیتیں اُس اندھے بہرے لزوم کے تجزیہ میں صرف کرتے رہتے ہیں جو خارجی قوتوں کا آفریدہ ہے لیکن اِن اصحابِ دانش کی پوری کوشش کے باوجود اس لزوم کی نہ تو صحیح بنیاد تلاش کی جاسکی ہے اور نہ اس کی نوعیت کا ٹھیک ٹھیک تعین ہوسکا ہے۔

اشپینگلر نے قوموں اور تہذیبوں کی زندگی کو افراد کی زندگی پر قیاس کر کے لزوم کا یہ نظریہ اخذ کیا کہ جس طرح ایک فرد کی زندگی لازمی طور پر طفولیت، شباب، کہولت اور بڑھاپے سے گزر کر موت کی نذر ہوجاتی ہے، بالکل اسی طرح قومیں اور تہذیبیں بھی خود بخود ان منازل کو طے کر کے موت کی آغوش میں سو جاتی ہیں۔ اندھا بہرا لزوم ہی اُنہیں ایک منزل سے ہانک کر دوسری منزل میں داخل کرتا ہے۔ قوموں کے اپنے عزائم اور تہذیبوں کے ذاتی اوصاف نہ تو اُن کے فطری ارتقاء کو روک سکتے ہیں اور نہ اُنہیں موت کی گرفت سے بچا سکتے ہیں۔

ہیگل کو یہ لزوم "روحِ عالم" (WORLD SPIRIT) میں جبکہ وہ جدلیاتی عمل میں مصروف ہو، جلوہ گر نظر آیا۔ اُس کا خیال یہ ہے کہ انسان تاریخ ساز نہیں بلکہ رُوحِ مطلق کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہے، لیکن غلط فہمی سے اپنے آپ کو اپنی تقدیر کا معمار سمجھتا ہے۔ وہ اس فریبِ نفس میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ مرکبِ زمانہ کا راکب بن کر کوئی عظیم تاریخی کردار ادا کر رہا ہے مگر اصل میں وہ رُوحِ مطلق (ABSOLUTE SPIRIT) کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوتا ہے اور یہ رُوح اُسے جس طرح چاہتی ہے سرگرمِ عمل رکھتی ہے۔

جو سوال اشپینگلر کے نظریۂ تاریخ میں کھل کر سامنے نہیں آیا تھا وہ ہیگل کے نظریہ میں نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے کہ کیا اِن خطوط پر تشکیل پانے والے نظریات کے اندر انسانی کردار کے اخلاقی وجوہ کا بھی کوئی مقام ہے۔ ہیگل اِس کا کوئی تسلی بخش جواب پیش نہیں کرسکا اور صرف یہ کہہ کر پہلو بچا گیا کہ "اخلاقی اکائی" سرے سے اپنا کوئی الگ وجود ہی نہیں رکھتی بلکہ اخلاقی وجود (MORAL ORGANISM) ریاست و معاشرے کا محض پر تو ہے۔ سادہ الفاظ میں اِس حقیقت کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ دُنیا

ہیں اخلاق کے کوئی معروضی معیارات (OBJECTIVE STANDARDS) نہیں پائے جاتے، بلکہ وہ ریاست اور معاشرے کے یکسر تابع ہیں۔ مملکت کا سربراہ جو کہے وہی درحقیقت اخلاقی سچائی ہے۔

جب ریاست کی خدمت ہی ہر فرد کا گوہر مقصود ٹھہرے اور مملکت کی بے چون وچرا اطاعت ہی اخلاق کا سب سے اونچا معیار قرار پائے تو نیکی اور بدی کا دینی تصور خود بخود معدوم ہو جاتا ہے۔ فرد اگر محض ریاست کے لیے جیتا ہے تو اُس کا اخلاقی معیار بھی مملکت ہی متعین کرے گی۔ لہٰذا جس چیز کو ہم استبداد یا حکومت کی چیرہ دستی یا معاشرے کی ستم رانی کہتے ہیں وہ ہماری کوتاہ نظری ہے۔ حکومت کے کسی فعل پر جور وجفا کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ وہ جو کچھ کرتی ہے رُوحِ مطلق کے اشارے پر کرتی ہے اور رُوحِ مطلق ہر عیب سے پاک ہے۔ کسی چیز اور کسی فعل کے صحیح اور برحق ہونے کا ایک ہی معیار رہ گیا کہ وہ چیز دنیا میں موجود ہے یا وہ فعل وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ ہیگل کے فلسفے نے نہ صرف دینی اقدار کو عوام کی نظروں سے یکسر گرا دیا ہے، بلکہ اندھی بہری جارحیت، صریح ظلم وزیادتی، کھلی ہوئی ناانصافی اور زبردست آزاری کو اخلاقی جواز بھی فراہم کیا۔ ہیگل کے اس فلسفے سے انسان کی ایک حد تک آزاد اور خود مختار حیثیت جو اُس کے اخلاقی احساس کی وجہ سے اُسے عطا ہوئی تھی اور جس کے سبب اُس کے خالق نے اُسے اشرف المخلوقات کی خلعت سے نوازا تھا، ختم ہو کر رہ گئی اور اس کے ساتھ وہ اُس عزّ وشرف سے بھی محروم ہو گیا جو اُس کا طرۂ امتیاز تھا۔

نقطۂ نظر کے اس بنیادی تغیر کے ساتھ تعلیم وتربیت کے نظام میں بھی وسیع پیمانہ پر تبدیلی پیدا ہوئی۔ انسان کے داخلی احساسات کو چونکہ خارجی قوتوں کا عکس سمجھ لیا گیا، اس لیے یہ باطل خیال لوگوں کے ذہن میں راسخ ہوتا چلا گیا کہ انسان کے باطن کی اصلاح سعیٔ لاحاصل ہے۔ اسے صحیح نہج پر چلانے اور ریاست اور معاشرے کا ایک مفید اور کارآمد پرزہ بنانے کے لیے قوانینِ مملکت میں مناسب تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس نئی طرز فکر کے بعد جو تعلیمی نصاب مرتب ہوا اُس میں سائنس اور صنعیات پر سارا زور صرف ہونے لگا اور معاشرتی علوم معیشت، معاشرت، سیاست، تاریخ، سائنسی علوم کے تابع بن کر رہ گئے۔ باقی رہے وہ مضامین جن کا تعلق انسان کے ظاہر سے زیادہ باطن سے تھا یعنی فلسفہ اور نفسیات، انہیں ازسرِنو اس انداز سے مرتب کیا گیا کہ اُن کے محققین اور معلمین

کی ساری صلاحیتیں صرف اس گمراہ کن نظریہ کو صحیح ثابت کرنے اور نوخیز نسلوں کے دل و دماغ میں تصور بٹھانے پر صرف ہونے لگیں کہ انسان صرف معاشی حیوان ہے اور اس کے اندر اخلاقی احساس و وجدان اور ضمیر کے وجود اور انسانی زندگی میں ان کی اثر آفرینی کی بات محض خام خیالی ہے۔

مارکس نے ہیگل کے فلسفۂ تاریخ سے روح مطلق کے متصوفانہ تصور کو تو خارج کر دیا لیکن معاشرتی تبدیلیوں کے جدلیاتی عمل کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ ہیگل کے نظریہ میں جو مرکزی اہمیت روح مطلق کو حاصل ہے، مارکس کے نظامِ فکر میں وہ اہمیت ذرائع پیداوار کو دی گئی اور اس نے پورے دعوے کے ساتھ یہ کہا کہ معاشرتی تبدیلیوں کو بروئے کار لانے والی فیصلہ کن قوت ہمیں نظریات و مقاصد میں نہیں مل سکتی بلکہ اس کا سراغ صرف ذرائع پیداوار میں رونما ہونے والے تغیر و تبدل میں ملتا ہے لہٰذا معاشرتی ترقی کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلہ کی طرف پیش رفت نے عقلی نظریات یا عدل و صداقت کے نئے تصورات کی رہینِ منت نہیں، کیونکہ ان سب باتوں کی حیثیت تو محض پرتو کی ہے، اصل چیز تو ذرائع پیداوار کی قوت ہے کیونکہ وہ ایک ایسے معاشرتی ماحول کو جنم دیتی ہے جس میں لوگوں کی خواہشات کو اپنے فطری اظہار کا موقع ملتا ہے۔ مارکس کی پیش کردہ تاریخی مادیت (HISTORICAL MATERIALIM) کی رو سے تمام نظریات و تصورات اور افعال و اعمال کی صورت گری صرف پیداآوری قوتیں ہی کرتی ہیں جنہیں مارکس نے تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کے نام سے موسوم کیا ہے۔

خارجی قوتوں کے ہاتھ میں انسان کی بے بسی اور روحانی احساس اور اخلاقی اقدار کے وجود کی یکسر نفی کا جو گمراہ کن نظریہ مغربی الحاد اپنے جلو میں لایا تھا اسے مارکس نے پوری قوت سے اس کے منطقی نتائج تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اگر انسان خارجی قوتوں کے ہاتھ میں محض کھلونا ہے تو پھر انفرادی خودی (INDIVIDKAL EGOTISM) کا وجود اس کی ترقی کی راہ کا سنگِ گراں ہے جسے اجتماعی خودی کی مدد سے جس قدر جلد ہٹایا جا سکے اسی قدر بہتر ہے، تاکہ انسان اخلاقی احساس، حق و انصاف کے دینی معیارات جنہیں وہ مقدس سمجھتا ہے اور خالقِ کائنات پر ایمان اور اسی قبیل کے دیگر اوہام سے نجات حاصل کر سکے۔

مشہور مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی (ARNOLD TOYNBEE) نے نسلوں اور قوموں کے تذکروں کے بجائے تہذیب و تمدن کو مطالعۂ تاریخ کی اساس قرار دے کر تاریخ کی فلسفیانہ بنیادوں میں

بڑی وسعت پیدا کی - اُس نے بلاشبہ انسان کی قوتِ تخلیق کو تاریخی عمل میں بہت حد تک دخیل کر کے خارجی قوتوں کے سامنے انسان کے احساسِ درماندگی کو بھی کسی حد تک کم کیا ہے، لیکن خود اُس نے تحدی اور جوابِ تحدی (CHALLENGE AND RESPONSE) کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ اپنے مضمرات کے اعتبار سے فلسفۂ ہیگل سے کسی طرح بھی مختلف نہیں - جس چیز کو ٹائن بی تحدی کہتا ہے اُس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ پیداآوری قوتوں کے بطن سے جنم لینے والے نت نئے مادی مسائل ہی ہیں - ٹائن بی نے اپنی معروف کتاب "مطالعۂ تاریخ" میں بیسیوں مسائل کا ذکر کیا ہے جو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے سامنے چیلنج بن کر اُبھرے - لیکن اُن میں سے کوئی ایک چیلنج بھی ایسا نہیں جس کی نوعیت مادی نہ ہو اور جس کے جواب کے لیے مختلف معاشروں کو مادی تدابیر اختیار نہ کرنی پڑی ہوں - کیا ہم ان کی تاریخ دانی سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ آج تک نوعِ بشری کو مادی اُلجھنوں کے علاوہ کبھی کوئی دوسری اُلجھن پیش نہیں آئی اور انہیں صرف معاشیات کے ناخنِ تدبیر سے حل کیا گیا - ٹائن بی صاحب اپنی ساری علمی فضیلت اور تاریخی بصیرت کے باوجود اس حقیقت کو سمجھ نہیں پائے کہ اگر انسان صرف مادی عناصر ہی کا تاریک پیکر نہیں بلکہ اُس میں اخلاقی اور روحانی احساسات کی قندیلیں بھی روشن ہیں تو اُسے مادی اُلجھنوں کے علاوہ روحانی اور اخلاقی اُلجھنیں بھی پیش آسکتی ہیں، لیکن ٹائن بی صاحب کے پیش کردہ فلسفۂ تاریخ میں یہ پہلو سرے سے غائب ہے - یوں نظر آتا ہے کہ تاریخ کا یہ مشہور عالم انسان کو دوسرے مادہ پرست مفکرین کی طرح زمان و مکان کے تقیدات کا پابند سمجھتا ہے اور اُس بے پناہ باطنی قوت کو نظر انداز کر دیتا ہے جس سے انسان زمان و مکان کو اپنا حلقہ بگوش بناتا ہے -

مغربی فلاسفۂ تاریخ حالات و واقعات کے تجزیہ میں اختلاف رائے رکھنے کے باوجود درج ذیل نکات پر ایک دوسرے سے پوری طرح متفق ہیں -

الف :- انسانی خودی خارجی قوتوں کی پابند ہے اور اُسے ارادہ و عزم کی کوئی آزادی حاصل نہیں -

ب :- لاشخصی اجتماعیت (COLLECTIVE IMPERSONAL) ہی کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور کسی فرد کے علیحدہ وجود کا تصور محض ابلہ فریبی ہے -

ج :- دنیا میں کوئی اصول بھی ابدی اور لازوال نہیں - اخلاق اور انصاف کا بھی کوئی غیر متبدل

معیار نہیں۔ اِس بناء پر اس دنیا میں کوئی قانون اور ضابطہ نہیں جسے عالمگیر سچائی کا نام دیا جا سکے۔

اسلام مذکورہ بالا تینوں نکات کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے جو ان سے قطعاً مختلف ہے۔

قرآن اِس بات کو تو تسلیم کرتا ہے کہ انسان کا جسمانی ڈھانچہ مادہ سے تیار ہوا ہے۔ اِس لیے اس کی مادّی ضروریات کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن وہ اِس حقیقت کو بھی برابر نگاہ میں رکھتا ہے کہ اس کے اندر روح کی جو شمع فروزاں ہے اُس نے اُسے معاشی حیوان کے درجہ سے اُٹھا کر مسجودِ ملائک کے بلند مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔ اسلام نے انسان کا ایک ایسا حقیقت پسندانہ تصوّر پیش کیا ہے جس میں اس کی عظمت و رفعت اور نکبت اور پستی دونوں کا نقشہ بیک وقت سامنے آجاتا ہے۔ اگر وہ زندگی کے ارفع و اعلیٰ مقاصد، جو درحقیقت اس کی روح کے تقاضے ہی ہیں، کو چھوڑ کر اپنی حیوانیت ہی میں گم رہنا پسند کرے تو پھر زمان و مکان کے تقیدات کا کیا ذکر، وہ مادّی قوتوں کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ شعور و آگہی سے پوری طرح فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے روحانی اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے پہ پوری توجہ دے تو نہ صرف مادی قوتیں اُس کے ہاتھ میں کھلونا معلوم ہوتی ہیں، بلکہ دورِ آفاق اپنی رفتار کے پیچ و خم کو اُس کے اشارۂ ابرو کے مطابق متعین کرتا ہے۔

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
ایں مُشتِ غبارے را انجم بسجود آمد

قرآن مجید نے انسان کی رفعت اور ذلت کا ذکر کئی مقامات پہ کیا ہے۔ یہاں ہم صرف ایک آیت پیش کرتے ہیں:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝	ہم نے انسان کو بہترین ساخت پہ پیدا کیا۔ پھر اُسے اُلٹا پھیر کر ہم نے پستوں سے پست کر دیا۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ اُن کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔

انسان کی بہترین ساخت پہ تخلیق کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو وہ اعلیٰ درجہ کا جسم عطا کیا گیا ہے جو کسی

دوسری مخلوق کو نہیں دیا گیا اور اُسے فہم و فراست، علم و عقل اور ضمیر و وجدان کی ایسی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئیں۔ پھر چونکہ انسان اپنی ان صلاحیتوں کی وجہ سے دوسری مخلوق سے مُمیّز اور ممتاز ہے، اِس لیے اس کا جسم مادہ سے عبارت ہونے کے باوجود اپنے اندر روحانی اور اخلاقی احساسات کے تابع رہنے کی پوری پوری استعداد رکھتا ہے اِلّا یہ کہ انسان حیوانی خواہشات میں اس حد تک کھو جائے کہ اُس کے یہ احساسات بالکل مُردہ ہو جائیں۔ نمک اگر اپنی نمکینی چھوڑ دے تو جس طرح اُسے اُٹھا کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے، اسی طرح اگر انسان اپنی سرکشی کی وجہ سے رُوحانی اور اخلاقی احساس سے تہی دامن ہو جائے تو پھر اُس کی پستی کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ بیکار، قابلِ نفرت اور ذلیل ہوتا ہے، کیونکہ اُس نے خدا کی نافرمانی سے اپنے آپ کو اُس بلند مقام سے خود نیچے گرا لیا ہے جس پر خدا نے اُسے فائز کیا تھا۔ اُس کا یہ طرزِ عمل خالقِ کائنات کے خلاف بغاوت تو خیر ہے ہی خود اپنی ذات کے ساتھ بھی صریح ظلم اور زیادتی ہے۔

انسان بلندی اور پستی کے یہ مختلف مدارج اُسی صورت میں طے کر سکتا ہے جب اُسے کسی حد تک فکر و عمل کی آزادی حاصل ہو، کیونکہ اگر وہ اپنے افکار و معتقدات اور افعال و اعمال میں آزاد نہ ہو تو اُس کے کسی قول و فعل کو محمود و مذموم نہیں کہا جا سکتا، اور اِس وجہ سے آخرت میں اُس کے اعمال کی کوئی بازپرس نہیں ہو سکتی۔ جب انسان کے متعلق یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ میکانکی طور پر وہی فکر اپنا لے اور وہی عمل سرانجام دینے پر مجبور ہے جس کا خارجی حالات اُس سے تقاضا کریں، تو اُس کی اخلاقی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کی عظمت کا سارا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے بُرائی کی راہ چھوڑ کر نیکی کے راستے پر گامزن ہو۔ آزادی کے صحیح استعمال ہی میں اس کے عزّ و شرف کا راز مضمر ہے۔ اگر انسان مجبورِ محض ہے تو اس کا کوئی فعل اخلاقی اعتبار سے کسی اہمیت کا حامل نہیں رہتا۔

قرآن مجید نے اِس حقیقت کو بار بار مختلف انداز میں انسان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً:

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ (اے نبیؐ) صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف

فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔
(۱۸ : ۲۹)

سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُورًا
(۷۶ : ۲، ۳)

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى
(۵۳ : ۳۹)

انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔
(۱۳ : ۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی۔

(باقی)

رُوداد ِ ابتلاء : احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

(۷)

ابوزعبل جیل کی بیرک میں تین دن گزر گئے۔ میں یہ خیال کرتا رہا کہ اب میری تفتیش پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ اس دوران میں بیرک کے دروازے سے باہر جھانک کر تعذیب کی رنگا رنگی دیکھتا رہا۔ تعذیب کے اسالیب کا مشاہدہ مجھے تعذیب کا نشانہ بننے والوں سے زیادہ مبتلائے الم کرتا۔ بیرک کا دروازہ جیل کے صحن کی جانب تھا۔ صحن کو جیل کی اصطلاح میں "محمصہ" (راہ کھلی) کہا جاتا تھا۔ صحن میں ان لوگوں کو بھر دیا جاتا جو تفتیش کے لیے اپنی باری کے انتظار میں ہوتے یا جنہیں تفتیش کے لیے تیار کیا جاتا۔ سب انسان اُسی طرح ننگے ہوتے جس طرح ان کی ماؤں نے انہیں جنا تھا۔ افسران شام کو اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ اور ان لوگوں کو نیند کی اجازت دیے بغیر چھوڑ جاتے اور صبح واپس آتے تاکہ تفتیش کے سلسلے میں کل جو کسر رہ گئی تھی اُسے آج پوری کرلیں۔ دوسری اذیتوں کے ساتھ ان لوگوں کو رت جگا کی اذیت دی جاتی، اگرچہ رت جگا بھی بذات خود بڑا المناک اور چھکے چھڑا دینے والا عذاب ہے اور اس کی شدت وہی سمجھ سکتا ہے جس کا اس سے پالا پڑا ہو ــــ یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ انسان کئی کئی دن تک نہ سوئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ ظالم افسران ان لوگوں کے ساتھ جبر و استبداد کے سنگین ترین ہتھکنڈے استعمال کریں جسمانی ایذا کے لیے بھی اور ذہنی ایذا کے لیے بھی۔ شومئی قسمت سے کچھ عرصہ بعد خود میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔

یہ مجبور و مقہور انسان دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوتے۔ ان کی آنکھوں پہ دبیز پٹی بندھی ہوتی۔ اسی حالت میں گھنٹوں گزر جاتے۔ کوئی یہ نہ جانتا کہ رات کب ختم ہوئی اور دن کب طلوع ہوا۔ اگر کسی کے جی

بیں آنا کر پٹی آنکھوں سے اُتار دے جس نے اُس کے دل و دماغ کو تاریکی ظلمت کے اندر غرق کر رکھا ہے تو اس کے لیے ہلاکت اور تباہی تیار تھی۔ ہر آدمی بلند آواز سے ایک مخصوص فقرہ دہراتا۔ اگر آغازِ شب میں وہ یہ رٹ شروع کرتا تو صبح طلوع ہونے کے بعد دوسرا حکم جاری ہونے تک وہ اسے رٹتا رہتا ـــــ ایک مجنونانہ سا فقرہ جس کے اعادہ کے لیے اُسے قطعاً نہ اُکتانا چاہیے ورنہ عذابِ الیم کا آتشین طوفان اُسے لپیٹ میں لے لے گا ـــ وہ فقرہ یہ ہے: "سمندر میں ساگ ہے" ـــ بالکل بیہودہ عبارت! ایک باشعور انسان اسے چلا چلا کر گھنٹوں رٹ رہا ہے، یا مثلاً کوئی ہندسہ منتخب کر لیا جاتا کہ اسے دُہرایا جائے۔ سات یا آٹھ یا نو، کوئی سا ہندسہ اور رات بھر اُسے بلند آواز سے بار بار پڑھا جائے ـــــ یہ منظر دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ جیل نہیں ہے پاگل خانہ ہے۔

جو اس جگہ پہنچ گیا اُس کے لیے کئی روز تک نیند اور کھانا حرام ہو جاتا۔ صبح سے شام تک اُسے صرف ایک گلاس پانی ملتا۔ اور جب اُسے ضروری حاجت لاحق ہوتی تو اُسے اپنی جگہ پہ ہی قضا کرنا ہوتا تھا۔

کچھ لوگ "اوکھلی" کے اندر لوہے کی سلاخوں کی بلند و بالا باڑھ پہ کئی کئی گھنٹے بٹھا دیے جاتے۔ گھنٹوں تک بیٹھنے والا انسان آخر تھک کر دیوار کی بلندی سے نیچے گر پڑتا۔ اُس کا سر پھوٹ جاتا، یا پنڈلی ٹوٹ جاتی یا کوئی اور چوٹ لگ جاتی۔ کسے ہو جائے کسے اس کی پروا تھی۔

کبھی کبھی بعض افسروں کو یہ سوجھتی کہ وہ "اوکھلی" کے اندر گھرے ہوئے مجبور و مقہور انسانوں سے اپنا دل بہلائیں۔ چنانچہ وہ آ کر اُن کے ساتھ اپنا "اچھا وقت" گزارتے۔ اور اذیت دینے کے جتنے فن اُنہیں معلوم ہوتے یا ان کا ذہن اختراع کرتا وہ دل لگی کے طور پہ اُسے روبکار لاتے۔ مثلاً: وہ سب لوگوں کو ایک طویل قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑا کر دیتے۔ اور خود قطار کے آخر میں کھڑے ہو جاتے۔ قطار کے آخر میں کھڑے ہونے والے شخص کو دونوں ہاتھوں سے ایک زور کا مُکا مارتے جو پرسکوت رات کے اندر گونج پیدا کر دیتا۔ اور پھر اُسے یہ حکم دیتے کہ وہ خود اگلے آدمی کو اسی قوت سے مُکا مارے یہاں تک کہ قطار کے دوسرے سرے پہ جو شخص کھڑا ہے باری اُس تک جا پہنچے۔ اور مزید شرم کی بات یہ ہے کہ فوجی افسر اس دوران میں اپنی گھڑی پہ نظر رکھتے اور اندازہ لگاتے کہ اُس کا یہ شرمناک اور اذیت بخش "پیغام" آخری انسان تک کتنے وقت میں پہنچا ہے۔ اور پھر اس "شرمناک کھیل" میں حصہ لینے والے نکبت زدہ انسانوں پہ بگڑ جاتے کہ وہ سست رفتاری سے کام لیتے ہیں۔ انہیں دھمکیاں دیتے اور طرح طرح

کی وعیدیں سناتے۔ اُن کا مطالبہ یہ ہوتا کہ یہ حرکت کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ رفتار کے ساتھ کی جائے۔

یہ لوگ ذہن و شعور کی قوت کھو چکے ہوتے۔ بُری طرح چکنا چور ہو جاتے۔ اِس ناپاک کھیل میں ان کی انسانی حس ماؤف ہو جاتی۔ ہر شخص تخفیف عذاب کے لالچ میں اس افسر کو خوش کرنے کی کوشش کرتا اور اُسے خوش کرنے کی ایک ہی تدبیر تھی کہ وہ اپنے سامنے والے شخص کو زیادہ سُرعت اور قوت سے تھپڑ مارے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد یہ فعل اس قدر توہین آمیز اور رُسواکُن صورت اختیار کر لیتا کہ اُسے دیکھ کر انسانیت آنسو بہاتی رہ جاتی ——— البتہ افسر صاحب باچھیں کھلا کھلا کے ہنستے۔ اور پورے ماحول میں صرف وہی ایک ہنسنے والے ہوتے۔ کائنات کی دوسری ہر چیز اس پر اشکبار ہوتی۔

جو افسران میری قطار میں یہ کھیل رچاتے رہے ہیں اُن میں میجر ز۔ ع تھا۔ اس شخص نے مزید یہ کیا کہ نظر بندوں کی دو قطاریں بنائیں اور انہیں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کر دیا۔ اور ایک قطار کو حکم دیا کہ وہ دوسری کو تھپڑ مارے۔ یہ کھیل باری باری ہر قطار انجام دیتی۔ میجر یہ دیکھتا رہتا کہ کون تھک ہار کر گر گیا ہے۔ یہ کھیل کئی کئی گھنٹے جاری رہتا۔ جب کوئی شخص درماندہ ہو کر گر جاتا تو میجر کی باچھیں کھل جاتیں۔

دیوار پہ جو لوگ لٹک رہے تھے ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں یا اس کے جسم پہ ایک کاغذ ہوتا تھا۔ جسے "روشتہ" کہا جاتا تھا۔ اس کاغذ میں اُس کے ساتھ معاملے کا طریق کار درج ہوتا تھا ——— یعنی: نام، بیت الخلاء جانے کا وقت، پانی کا ایک گلاس پینے کا وقت، روٹی کھانے کا وقت، اور اُسے زدوکوب کرنے کا وقت ——— رسد کا حساب دنوں کی رُو سے کیا جاتا مگر زدوکوب کا حساب گھنٹوں کے لحاظ سے ہوتا۔ یعنی پانی دن میں ایک بار، مگر زدوکوب کے لیے ایک "بوچھاڑ" سے لے کر دوسری "بوچھاڑ" تک صرف دو گھنٹے کا وقفہ۔

ایک صبح ایسی بھی طلوع ہوئی کہ چڑیوں کے چہچہوں کے ساتھ ہی میں بھی "اوکھلی" میں داخل ہو چکا تھا اور مجھے بھی جلتے ہی ایک "طریحہ" لینا پڑا یعنی ڈنڈوں کی لگاتار خوراک۔ میں نے تقریباً دو سو ڈنڈے کھائے اور پھر لوہے کی سلاخوں پہ لٹکا دیا گیا۔ مجھے یہ "طریحہ" (ڈنڈوں کی لگاتار بوچھاڑ) ہر ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ملتی رہی۔

تین روز تک میں آہنی سلاخوں پر لٹکا رہا۔ نیند اور آرام سے محروم۔ آج بھی اس واقعہ کی یاد دل کو ہلا دیتی

ہے۔ اس واقعہ کا اظہار تو چند لفظوں میں ہو جاتا ہے جنہیں انسان ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اُس وقت یہ واقعہ میرے لیے اس قدر شدید و سنگین تھا کہ بیان سے باہر ہے، اور الفاظ اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ واقعہ اب بھی خدا کی یاد اور آخرت کا خوف دلا دیتا ہے۔ میرے پہلو میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی لٹکے ہوئے تھے ——— سُنا ہے وہ مصر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئے ہیں ——— اُن کی حالت مجھ سے بھی بدتر تھی لیکن اس کے باوجود انہیں مجھ پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ درد گردہ کا بیمار بن جاؤں۔ اس مرض کی علامات بھی انہوں نے مجھے تفصیل سے بتا دیں۔ میں نے بہتر یہ سمجھا کہ ابھی ان علامات کو محفوظ رکھوں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی دن یا کوئی گھڑی ایسی آوارد ہو جو موجودہ صورتِ حال سے بھی زیادہ سنگین ہو۔ اور اُس وقت یہ حربہ کام آئے گا۔ کوئی پوچھ سکتا ہے کہ کیا وہ لوگ دردِ گردہ کے مریض کے ساتھ رعایت کرتے تھے؟ جواب: جی ہاں، اسی قدر رعایت کرتے تھے جس سے انسان اُس وقت تک زندہ رہے جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی۔ معلومات حاصل کرنے کا لالچ انہیں ہمیں زیادہ دیر تک زندہ رہنے کا خواہشمند بنائے رکھتا تھا۔

سنگین گھڑی آ ہی گئی ——— میجر ف۔ ع کی سرپرستی میں میری طرف اژدہا جیسے ڈنڈوں کا رُخ ہو گیا۔ سخت بوچھاڑ ہونے لگی۔ شدتِ کرب سے میرا دماغ چل گیا۔ اور میں پاگلوں کی طرح چیخیں مارنے لگا۔ اور واویلا کیا کہ مجھے دردِ گردہ کی شکایت لاحق ہو گئی ہے ——— یہ سُن کر انہوں نے مارسے ہاتھ کھینچ لیا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ مجھ سے معلومات حاصل کیے بغیر ——— جو ان کے خیال کے مطابق میرے پاس تھیں ——— مجھے جان سے مار دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

جیل کا بدمعاش ڈاکٹر آیا اور اس نے مجھے درد کا انجکشن دے دیا۔ اور مجھے استراحت کی ہدایت کی۔ اور میری استراحت یہ تھی کہ میں پوری رات دیوار کے پہلو میں جاگتے ہوئے بیٹھا رہوں۔ چنانچہ یہ استراحت مل گئی مگر ظاہر ہے کہ نیند کی اجازت نہ ملی۔ یہ بڑی کٹھن رات تھی۔ نیند مجھ پر ہر طرف سے حملہ آور ہو رہی تھی مگر اسے روکنے کا عذاب میرے لیے تازیانوں کی مار اور آگ کے داغوں سے زیادہ سخت تھا ——— یہ بات صرف تجربے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

صبح ہوئی۔ اب ایک نئی افتاد آ پڑی۔ ہمیں حکم ملا کہ ہم پشت کے بل لیٹ جائیں اور اپنی ٹانگیں اُوپر ہوا میں اُٹھا لیں۔ اور ہم ایک طویل قطار میں برابر لیٹیں۔ بریگیڈیر اے آر ہمارا معاینہ کریں گے۔ بریگیڈیر آ گیا،

اس کی اردل میں تین ہٹے کٹے سپاہی تھے۔ نئے احکام کے تحت ہم نے آنکھوں کی پٹی کے اوپر جیکٹ ڈال رکھے تھے تاکہ چہرے کی کوئی چوٹ ظاہر نہ ہو۔ بریگیڈیر نے قطار کے ابتدائی سرے سے معائنے کا آغاز کیا۔ ہر شخص کے قریب ہو کر اس کا نام دریافت کرتا۔ وہ اپنا نام بتاتا۔ بریگیڈیر کو پہلے سے نہ صرف تمام لوگوں کے نام یاد تھے بلکہ وہ ان کے تفتیش طلب موضوعات سے بھی آگاہ تھا۔ ہر شخص کا نام پوچھنے کے بعد متعلقہ موضوع کے بارے میں بھی اس سے سوال کرتا۔ اور حسب معمول وہ اس کے جواب سے خوش نہ ہوتا۔ اور اپنے ایک سپاہی کو زیر لب کہہ دیتا: "پچاس" یا کہہ دیتا: "تیس" اور بعض اوقات "سو" کا حکم بھی صادر فرماتا۔ اس تعداد کا مطلب یہ تھا کہ چوب زنی کے ذمہ دار لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ بریگیڈیر نے جس شخص کے متعلق جو تعداد بتائی ہے اس سے کم کسی حالت میں اسے ڈنڈے نہ لگائے جائیں۔ ان لوگوں کے تیس ڈنڈے پچاس کے مساوی اور پچاس اسّی کے مساوی ہوتے تھے۔ جو شخص قطار کے آخر میں لیٹا تھا اس کے لیے لازم تھا کہ وہ اس وقت تک ٹانگیں اوپر اٹھائے رکھے جب تک بریگیڈیر وہاں تک پہنچ نہ جاتے۔ اگر کوئی بے بس ہو کر ٹانگیں نیچے کر لیتا تو اس کی شامت آجاتی۔ اس کی یہ لوگ تکا بوٹی کر دیتے۔

صبح سویرے یوں لیٹنے کا سلسلہ روزانہ کا معمول بن گیا اور یہ دو ڈھائی گھنٹے تک جاری رہتا۔ لوگوں نے رات بھی اس حالت میں گزاری ہوتی کہ ان کے تو لی جکنا چور ہوتے۔ کیونکہ وہ پوری رات لازمی ورزشوں یا ڈنڈوں کی ضربات، یا لوہے کی سلاخوں پر معلّق ہو کر گزارتے۔ اور اب پاؤں جسم سے جدا ہو چکے ہوتے۔ اور پھر "قطار صبحگانہ" سے فارغ ہوتے ہی ہر شخص لوہے کی سلاخوں والی دیوار پر اپنی اپنی جگہ پر چڑھ جاتا۔ اور ہر ایک اس انتظار میں ہوتا کہ افسر آئے اور اس کی تفتیش کا آغاز کرے۔

رات کے وقت میجر ف۔ ع میرے پاس آیا۔ بد قسمتی سے میرا قرعہ فال اس کے نام نکلتا رہا یا اس کا قرعہ فال میرے نام۔ دیوار کے باہر میری طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ یہ دیکھ کر طیش میں آگیا کہ میں نے لباس پہن رکھا ہے۔ "محمد صبر" ہیں ڈیوٹی پر جو سپاہی تھا اسے طلب کیا اور اسے بے حد فحش گالیاں دے کر کہنے لگا کہ "کس ذلیل نے اسے لباس پہننے کی اجازت دی ہے"۔ سپاہی نے اسے بتایا کہ یہ دردِ گردہ میں مبتلا ہے۔ اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہی اسے یہ سہولت دی گئی ہے۔ میجر صاحب نے خود ڈاکٹر کو بھی مغلظات سے نوازا۔ اور یہ جھگڑا یوں ختم ہوا کہ میں دیوار پر سے اتار دیا گیا اور تمام کپڑے اتار کر مجھے خوب گرم "پوچھاڑ" دی گئی۔ یہ "خوراک" لینے کے بعد دوبارہ دیوار پر جا بیٹھنے کا حکم ہوا ——

میجر پھر میرے قریب ہوا - اُس کی آنکھوں میں انتہائی خوفناک چمک تھی - ہاتھ میں جلتا ہوا لائٹر لے رکھا تھا - جب اُسے میں نے اپنے ننگے جسم کے ساتھ آگے بڑھتے دیکھا تو بدحواس ہو گیا - میں نے خیال کیا کہ اگر یہ شعلہ میرے جسم پہ لگا دیا گیا تو میں تو بلاشبہ مر جاؤں گا - میجر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ - میرے جسم کے مختلف حصّے لائٹر سے جلا دیے - مجھے شدید تکلیف ہوئی، ناقابلِ بیان تکلیف، سڑی ہوئی کھال کی بُو خود مجھے آنے لگی ——— مگر پھر بھی موت نہ آئی -

میجر ف - ع نے فضول اور نہ ختم ہونے والی گفتگو چھیڑ دی اور وہ یہ تھی :

س : کیا تم کچھ نہیں کہنا چاہتے ؟

ج : کس چیز کے بارے میں ؟

س : اس مرتبہ ہم معین بات سننا چاہتے ہیں -

ج : وہ کونسی معین بات ؟

س : یحییٰ حسین کے بارے میں کیا جانتے ہو ؟

ج : جو کچھ مجھے معلوم تھا میں پہلے ہی بتا چکا ہوں - کوئی اور بات میرے پاس نہیں ہے ؟

س : کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ الاخوان المسلمون کی خفیہ تنظیم کا رکن ہے ؟

ج : ہرگز نہیں -

س : تمہاری آخری ملاقات اُس سے کب ہوئی ؟

ج : چند ماہ پیشتر -

س : یعنی وہ سوڈان بھاگنے سے پہلے تم سے نہیں ملا ؟

ج : ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی -

س : تو گویا آپ الاخوان المسلمون کی تنظیم کے رکن ہیں ؟

ج : ہرگز نہیں -

س : تم اُس کے رکن کیوں نہیں بنے ؟

ج : اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے -

س : بات کی وضاحت کیجیے ؟

ج : کیا آپ کی رائے ہے کہ میرے لیے یہی مناسب تھا کہ میں اخوان کی تنظیم کا رکن ہوتا ؟

س : اسی چیز کی آپ ہمارے سامنے تشریح کریں۔

ج : جس تنظیم سے آپ کی مراد ہے اس میں مجھے شمولیت کی دعوت نہیں دی گئی۔

س : اس کے باوجود کہ آپ ان کی بہت بڑی تعداد سے واقف ہیں ؟

ج : جی ہاں، اس کے باوجود کہ میں ان کی بہت بڑی تعداد سے واقف ہوں۔

س : تم جھوٹ بول رہے ہو۔

ج : پھر سچ کیا ہے ؟

س : سچ یہی ہے کہ تم اخوان کی تنظیم کے رکن ہو۔ یہ بات تمہیں تسلیم کرنا پڑے گی۔ سمجھے ؟

ج : سمجھ گیا ہوں۔

س : اچھا تو بتاؤ کیا کہتے ہو ؟

ج : آپ کے فیصلے کے بعد میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہی کہ میں اخوان کی تنظیم کا رکن ہوں۔

س : تنظیم کی قیادت سے بھی تعلق ہے !

ج : تنظیم کی قیادت سے بھی تعلق ہے۔

س : بلکہ تم تنظیم کے ایک لیڈر ہو۔

ج : ---------

س : خاموشی کیوں اختیار کر لی ہے ؟

ج : سمجھ نہیں آتا کہ کیا کہوں۔

س : (میجر پھنکارتے ہوئے) تمہیں کہنا ہوگا۔ ورنہ تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔

ج : ہم متفق ہیں۔

س : کس چیز پہ ؟

ج : یہ کہ میں تنظیم کا ایک لیڈر رہوں۔

س : یہ اقرار نامہ تحریر کرنا ہوگا ـــ ایسا ہی ہے نا ؟

ج : بشرطیکہ عذاب سے نجات مل جائے۔

س: ہم متفق ہیں۔ مار پیٹ سے تمہیں نجات دے دیتے ہیں۔ آؤ۔ کیا لکھو گے؟

ج: یہی لکھوں گا کہ میں الاخوان المسلمون کی جماعت کا رکن ہوں۔

س: پھر؟

ج: پھر یہ لکھوں گا کہ میں تنظیم کا ایک لیڈر رہوں۔

س: پھر ہمیں اخوان، تنظیم اور اس کی قیادت کے بارے میں مکمل تفاصیل بتانا ہوں گی۔

ج: میجر صاحب! یہ بات ناممکن ہے۔ جو الفاظ آپ نے کہے ہیں۔ ان سے زیادہ میں ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔ آپ جو چاہیں میرے ساتھ کریں۔ جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا.... یقین جانیے۔

اس کے بعد مجھے سنگین عذاب کے کولھو میں جوت دیا گیا۔ بدبختی، الم اور کرب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یہ کارروائی عام گرفتاریوں کے حکم سے پہلے جو ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو صادر ہوا، عمل میں آئی۔ عام گرفتاریوں کا حکم صادر ہونے کے بعد ہر بات میں تبدیلی واقع ہو گئی۔ کیونکہ اس حکم میں صاف کہہ دیا گیا کہ اخوان المسلمون کے جو لوگ پہلے (۱۹۵۴ء میں) گرفتار ہوئے تھے ان سب کو دوبارہ گرفتار کر لیا جائے۔ اور مزید یہ کہ وزیر داخلہ کو یہ اختیارات دے دیے گئے کہ وہ جس شخص کو بھی مشکوک سمجھتا ہو اس کی گرفتاری کے احکام صادر کر سکتا ہے ——— یہ بھی ایک مستقل کہانی ہے۔

۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ گرفتاریوں کے ہمہ گیر حکم سے پہلے ابوزعبل کی جیل میں نظربندوں کی بہت بڑی کھیپ آئی۔ اس میں میرا بھائی بھی تھا۔ جس کا اس وقت کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا، ماسوائے اس کے کہ میرے ایک دوست کے ساتھ اس کی جان پہچان تھی۔ میرے بھائی نے کسی تقریب پر اسے رسمی خط بھیج دیا۔ میرا دوست یحییٰ حسین کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ اور اس گرفتاری کے موقع پر میرے بھائی کا رسمی خط اس کے کاغذات میں سے برآمد ہو گیا۔ گرفتار کرنے والوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ جسے گرفتار کرتے تھے اس کے قبضے میں جو کاغذات ہوتے تھے ان میں جس جس شخص کا نام لکھا ہوتا تھا اسے بھی گرفتار کر لیتے۔ خواہ وہ کاغذات قرض کے لین دین کی دستاویزات کیوں نہ ہوں۔

ایک بات ایسی تھی جو میں نے انٹیلی جنس والوں سے چھپا رکھی تھی۔ اس مخفی بات کا تعلق میری نظر میں ریاست کی سلامتی اور امن اور نظام حکومت سے قطعاً نہ تھا۔ لیکن میرے ایک دوست نے ——— جو نئی کھیپ میں آیا تھا ——— اس مخفی بات کا جسے میں نے تحقیقات کے ابتدائی ایام میں جان پر کھیل کر

چھپائے رکھا تھا ، انکشاف کر دیا - میرا یہ دوست بھی اس بنا پر گرفتار کر لیا گیا تھا کہ یحییٰ حسین کے دوستوں میں سے کسی صاحب کے گھر میں ایک ایسا عید کارڈ پایا گیا جس پر میرے اس دوست کا نام تھا - بہر حال جب میرا دوست ابوزعبل جیل میں آیا ، میں نے اُسے ملتے ہی اُس کی گرفتاری کا سبب بتا دیا - اور اُسے تاکید کر دی کہ میں جس بات کو چھپا کر رکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں اُسے وہ بھی بھول جائے - لیکن اسے خدا معاف کرے جونہی اُس پر تعذیب و تشدد کی بوچھاڑ ہوئی اُس پر ہذیان کی کیفیت طاری ہوگئی اور اُس نے ہر اُس بات کی جسے وہ جانتا تھا یا نہیں ، تصدیق کرنا شروع کر دی - اس کے سپاہیوں نے مجھے بھی طلب کر لیا - اور بس پھر کیا تھا - آفت ٹوٹ پڑی - دنیا اندھیر ہوگئی اور غلغلہ رستا خیز برپا ہو گیا -

پھر ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دن آیا - اور یہ دن بھی یوم الحشر سے کم نہ تھا - بالائی مصر سے نو گرفتاروں کی ایک بہت بڑی کھیپ جیل میں وارد ہوئی - ان کی تعداد ۹ سو سے زیادہ تھی - اس دور میں اقتدار کی قربان گاہ پر جو انسانی قربانی دی گئی ہے اُس کا ایک بڑا حصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا - ان سب کو فوجی افسران کی طرف سے حکم ملا کہ ایک جگہ پر اپنا سامان رکھ دیں - چنانچہ ہر شخص نے پریشان ہو کر اپنا اپنا سامان پھینک دیا - اور پھر یکا یک ان لوگوں کے تن کے کپڑے اُتار دیے گئے - اور ان پر لاٹھیاں برسنے لگیں - یہ مسکین دیہاتی برہنہ جسم مار کی شدت سے یوں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے جیسے چوہے بدحواس ہو کر ایک بڑے پنجرے میں پھدک رہے ہوں - ان کی تعداد زیادہ تھی ، اس لیے صحن میں دوڑ بھاگ کی زیادہ گنجائش نہ تھی - صحن کے منظر نے انہیں مزید سراسیمہ بنا دیا تھا ——— وہ منظر یہ تھا کہ لوہے کی سلاخوں پر کچھ انسان لٹک رہے ہیں - جگہ جگہ سے ان کا خون رِس رہا ہے اور زخموں سے پیپ کی بدبو اُٹھ رہی ہے - خوف اور سراسیمگی کی وجہ سے یہ لوگ پاگل ہو ہو کر گر رہے ہیں -

چیخنے کی آوازیں ہر جگہ سے سنائی دے رہی تھیں - لیکن ہم لوگ جو پہلے سے سلاخوں پر لٹکے ہوئے تھے ، خوف و دہشت سے بڑی حد تک نجات پا چکے تھے کیونکہ ہم جلادوں سے مانوس ہو چکے تھے لیکن بار بار کوشش کے باوجود جس چیز سے میں نجات نہ پا سکا وہ تھا کرب !

میں نے دل کو بڑا سمجھایا کہ کرب درحقیقت انسان کے دماغ کے کسی گوشے میں ایک احساس اور تصور کا نام ہے - اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے - اور ایک تصور و احساس پر کسی دوسرے برتر و مستحکم تر تصور و احساس کی مدد سے میں غلبہ پا سکتا ہوں - یوں احساسِ کرب معدوم ہو جائے گا اور دوسرا احساس اُس کی جگہ لے لے گا -

اس طرح کی باتیں اپنے دل سے میں ہر اُس موقع پر کرنے لگتا جب مجھے تعذیب کی ٹکٹکی پر لٹکنا ہوتا تھا۔ بلکہ میں ذہن کو اس فلسفے پر مرکوز بھی کر لیتا تھا۔ مگر تعذیب کی ایک ہی لپیٹ سے میرا سارا فلسفہ کافور ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ نظریہ اپنی جگہ درست ہو۔ لیکن یہ بھی تو ضروری ہے کہ قلب ودل احساس اپنی قوت وتاثیر اور سنگینی وشدت میں کرب سے فائق تر ہونا چاہیے۔

ابوزعبل کی جیل میں آغازِ کار میں تعذیب کا دارومدار زیادہ تر ذہنی عذاب دینے پر ہوتا تھا ——— مثلاً یہ کہ انسان کو بالکل برہنہ کر دیا جاتا تاکہ انسان خود اپنی نظروں میں اپنی قیمت کھو بیٹھے۔ اور اُسے یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ ایک ہیچ اور بے وزن مخلوق ہے۔ اور پھر اُس کی زیادہ سے زیادہ توہین کی جاتی جو اُس کے دل ودماغ کے اندر ایک خوفناک تہلکہ برپا کر دینے والی چیز ہوتی تھی۔ اور اس کے بعد اُسے بے تحاشا زدوکوب کیا جاتا، آگ سے داغا جاتا، اور بھوک اور پیاس کی مار دی جاتی۔

ابوزعبل جیل کا بنیادی آلۂ ضرب ڈنڈا تھا۔ اور اس کے انتخاب میں بھی ایک راز پنہاں تھا۔ وہ یہ کہ ڈنڈا جسم پر گہرا اثر نہیں چھوڑتا۔ یا اس کی چوٹ کا زود یا بدیر علاج کیا جا سکتا ہے ——— اگرچہ اس ڈنڈے نے اکثر اوقات کئی مظلوم انسانوں کی جانیں لے لیں۔ جہاں تک چرمی تازیانے کا تعلق ہے تو انٹیلی جنس والے اسے شاذونادر ہی استعمال کرتے تھے۔ اور وہ بھی زیادہ تر خوف زدہ کرنے کے لیے۔ اس لیے کہ اس کے ہوا میں لہرانے سے ایسی جھنکار پیدا ہوتی تھی جو کڑیل سے کڑیل لوگوں کا پتہ بھی پانی کر دیتی تھی۔

ابوزعبل جیل کی انٹیلی جنس اور فوجی جیل کی کریمنل ملٹری انٹیلی جنس کے درمیان یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر تعذیب وتشدد کے باب میں مہارت، چابکدستی اور فن کا زیادہ مظاہرہ کرتے ہیں اور ثانی الذکر سنگدلی اور تذلیل میں زیادہ بڑھ کر ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ سول انٹیلی جنس کی جیلوں میں جو لوگ موت کے گھاٹ اُترتے ہیں فوجی جیلوں میں مرنے والوں کی تعداد اُن سے دوگنا ہے۔

جس دوست کے بارے میں میں نے عرض کیا ہے کہ اُس نے میرے پوشیدہ راز کو فاش کر دیا وہ عام الحزن یعنی ۱۹۶۵ء کے ماہ اپریل اور ماہ مئی میں میرے ساتھ باہمی مذاکرہ ومطالعہ میں اپنی شامیں گزارتا رہا ہے ——— یہاں یہ مناسب ہوگا کہ میں وہ راز بتا دوں جسے میں انٹیلی جنس والوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں ——— وہ راز تھا: ہم نے خالصتہً دینی اور علمی اور تربیتی سرگرمیوں کا ایک نظام

قائم کر رکھا تھا۔ ہم لوگ عالم اسلام کے حالات کا اجتماعی مطالعہ کرتے۔ ہم میں سے کچھ احباب اس موضوع پر لیکچر تیار کرتے۔ ہم نے اس دلچسپ پروگرام کا ایک عمدہ آغاز کر لیا تھا۔ ہم مطالعہ و تحقیق کی خاطر جمع ہوتے اور اس اجتماع کے ذریعے سے اپنی فکری اور ذہنی تربیت کرتے۔ یہ پروگرام مرحلہ آغاز ہی میں تھا کہ دار و گیر کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اگر میں انٹیلی جنس کے افسران سے یہ بیان کر دیتا کہ ہم محض تعلیم و تربیت کی خاطر یہ پروگرام جاری کیے ہوئے تھے، تو وہ ہرگز مجھ پر یقین نہ کرتے۔ لہٰذا میں نے خوب غور و خوض کے بعد یہ طے کیا کہ یہ بات انہیں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ اسی دوران میرا دوست جیل میں آوارد ہوا۔ اور اس نے ہمارے اجتماعات کی کہانی بڑی سادگی کے ساتھ ارباب تفتیش کے سامنے بیان کر دی۔ مگر ان کے لیے یہ توجیہ کافی ثابت نہ ہوئی کہ ہمارے اجتماعات محض علم و تربیت کی خاطر تھے۔ بلکہ انہیں اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ہم حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے میٹنگ کرتے رہے۔

مصر کے تحفظ امن عامہ کے تمام ادارے اس وہم میں مبتلا تھے کہ تمام مصری قوم عبد الناصر کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کر رہی ہے۔ اور میرے دوست کے لیے بھی ناقابل تصور زد و کوب کے بعد کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ہمارے اجتماع کے معاملے کو بھی ایک سازش تسلیم کرے۔ مگر اس سازش کو واضح اور مبرہن کرنے کے لیے ایک عمدہ کہانی تصنیف کرنے کی ضرورت تھی۔ اب یہ دقت پیش آئی کہ سازش کی مسلسل اور مربوط کہانی کیسے وضع کی جائے۔ گو ہم نے بہت کچھ تسلیم کر لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود کہانی مکمل نہ ہو پائی۔ کسی اقرار نامے پر دستخط کر دینا آسان ہے مگر کہانی کی تصنیف بہت مشکل۔ میں پیچھے بیان کر چکا ہوں کہ تفتیش کے پہلے ہی مرحلے میں میں نے وہ سب کچھ تحریر کر دیا جو میجر ف۔ ع نے مجھے املا کروایا تھا۔ اور اس پر میں نے بقلم خود دستخط بھی کر دیے تھے۔ اور اب تو مجھے یہ بھی پوری طرح یاد نہیں آ رہا کہ میری تحریر کے اصل الفاظ اور مضمون کیا تھا لیکن یہ خوب یاد ہے کہ کہانی بڑی بے ڈھب اور بے ربط اور بے جان تھی — ایک ایسی من گھڑت سازش کی کہانی جو ایک ایسی حکومت کے خلاف کی گئی جسے قوم دل کی گہرائیوں سے ناپسند کرتی تھی اور جس سے نجات پانے کے لیے وہ گن گن کر گھڑیاں گزارتی رہی۔ (باقی)

رسائل و مسائل

مُسلم حکومتوں کے معاملہ میں جماعت اسلامی کا مسلک

سوال:۔ انگلستان سے ایک صاحب نے مجھے لکھا ہے:

"مختلف مسلمان حکومتوں، خصوصاً سعودی حکومت کے ساتھ اسلامی کارکنوں کے تعاون سے بہت کچھ نقصان ہو رہا ہے۔ ہم نے اسلامک کونسل آف یورپ کی طرف سے منعقد کی جانے والی بین الاقوامی معاشی کانفرنس میں یہ مشاہدہ کیا ہے کہ اس چال کے ذریعہ سے مسلم حکومتوں کے معاملہ میں اسلام کے موقف کو طرح طرح کی غلط فہمیوں میں اُلجھا دیا گیا ہے۔ اسلامک کونسل آف یورپ نے اس کانفرنس میں اسلام کی بہت سی بنیادی تعلیمات کو اُلٹ کر رکھ دیا ہے۔ بعض لوگ جو آپ کی تحریک سے مضبوط تعلق رکھتے ہیں اُن کی اِس کانفرنس میں شرکت لوگوں میں یہ خیال پیدا کرنے کی موجب ہوئی ہے کہ انہیں آپ کی تائید حاصل ہے، اور یہ چیز مسلمان حکومتوں، خصوصاً سعودی حکومت کی پالیسیوں کو سندِ جواز بہم پہنچاتی ہے۔ ہم پورے زور کے ساتھ اصرار کرتے ہیں کہ آپ اپنی تحریک کے کارکنوں کو مسلم حکومتوں کی خدمت انجام دینے والی قومی اور بین الاقوامی ایجنسیوں اور پلیٹ فارموں سے الگ رکھنے کے لیے اپنا پورا اثر استعمال کریں۔"

اس خط کے ساتھ ایک محضر نامہ بھی ہے جس پر بہت سے اشخاص کے دستخط ہیں۔

جواب:۔ آپ کا خط ملا۔ جس کی تائید میں بہت سے اشخاص کے دستخط بھی ہیں۔ مسلم حکومتوں کے بارے میں میری اور جماعت اسلامی پاکستان کی پالیسی مختصراً یہ ہے:

۱۔ وہ مسلم حکومتیں ہیں، اسلامی حکومتیں نہیں ہیں۔ یعنی وہ چونکہ مسلمان ملکوں کی حکومتیں ہیں اور ان کے

فرمانروا مسلمان ہیں، اس لیے ہم انہیں مسلم حکومتیں کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ اسلام کے اصولوں پر قائم نہیں ہیں اور اسلامی احکام کی یا تو کلی طور پر، یا جزوی طور پر پابند نہیں ہیں، اس لیے ہمارے نزدیک وہ اسلامی حکومتیں نہیں ہیں۔ اس بات کو ہم نے اپنے لٹریچر میں اس قدر کثرت کے ساتھ اور اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کوئی شخص جس نے یہ لٹریچر دیکھا ہو اس معاملہ میں ہماری پوزیشن کے متعلق کسی غلط فہمی میں نہیں رہ سکتا۔

۲۔ ہم اپنے ملک (پاکستان) میں براہ راست، اور تمام مسلم ممالک میں احیاء اسلام کی تحریکات کے تعاون سے، اور ساری دنیا میں بالعموم اپنے لٹریچر اور اسلامی دعوت کے کارکنوں کی وساطت سے اسلام کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ بات کسی قیمت پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اسلام کے ساتھ کسی دوسری آئیڈیالوجی کی آمیزش کی جائے۔

۳۔ مگر ہم اسلامی دعوت اور اقامتِ دین کے لیے کام کرتے ہوئے اِس امرِ واقعہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ہم اپنے ملک میں، یا کسی مسلمان ملک میں، یا دنیا میں کسی جگہ بھی خلا میں کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی حکومت اقتدار پر قابض ہے، کوئی نہ کوئی نظامِ زندگی (خواہ وہ خالص کافرانہ ہو یا اسلام اور غیر اسلام کا مخلوطہ ہو) عملاً قائم ہے، اور مسلمان ملکوں کے مسلم عوام و خواص بھی اسلام کے علم و عمل سے بڑی حد تک عاری ہیں۔

۴۔ اس امرِ واقعہ کو ایک حقیقی واقعہ سمجھ لینے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی اور اقامتِ دینِ اسلام کا کام عملاً کس طرح کیا جائے؟ کیا ان مختلف قسم کی حکومتوں اور اسلام سے ناواقف کروڑوں مسلم عوام کی آبادیوں کو غیر موجود فرض کر لیا جائے؟ یا ان سب کے خلاف جنگ کی جائے؟ یا ان سے قطعی لاتعلق ہو کر ان حکومتوں اور ان کی مسلم آبادیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان پر اثر انداز ہونے کے تمام مواقع سے دستبرداری اختیار کر لی جائے؟

۵۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اور آپ کے ہم خیال لوگ ان میں سے کس صورت کو پسند کرتے ہیں۔ البتہ اپنے اور اپنی جماعت کے متعلق میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم ہر ملک کے حالات کو دیکھ کر اور اچھی طرح سمجھ کر اُس میں دعوت و تحریک کے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں جو قرآن و سنت کی تعلیمات ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں مگر ان تعلیمات کو ہر جگہ کے حالات پر اُن کی مناسبت سے منطبق کیا جاتا ہے۔ اپنے ملک میں ہم نے ایک طرف عوام اور خواص کے اندر اسلام کا علم بڑے پیمانے پر پھیلایا، دوسری طرف ملک کی آبادی

میں سے جو لوگ اقامتِ دین کا کام کرنے کے لیے ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے انہیں ہم نے منظم کیا، اور تیسری طرف ہم مسلسل یہ کوشش کرتے رہے کہ حکومت کے نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کیا جائے۔ دوسرے مسلمان ملکوں میں ہم براہ راست اِس طرح کی کوئی جدوجہد نہیں کرسکتے تھے، اس لیے ہم نے اپنا لٹریچر اُن میں پھیلایا، ان کے اندر جو لوگ اسلامی تحریک کا کام کرنے کے لیے اُٹھے یا جو پہلے سے کام کر رہے تھے، اُن کے ساتھ اپنی حدِّ وسع تک تعاون کیا، اور اُن کی حکومتوں کے مقابلہ میں حتی الامکان کوئی مخاصمانہ رویہ اختیار نہ کیا تاکہ ہمارے خیالات وہاں پھیلنے میں رکاوٹیں پیدا نہ ہوں۔

۶۔ آپ نے خاص طور پر سعودی کا ذکر کیا ہے جس کی حکومت کے ساتھ ہمارا رویّہ دوسری حکومتوں سے مختلف ہے۔ اِس کے وجوہ میں آپ کو بالکل بے لاگ طریقے سے بتائے دیتا ہوں، خواہ آپ کو اور آپ کے ہم خیال لوگوں کو اس سے اتفاق ہو یا اختلاف۔ ہمارے نزدیک سعودی عرب کی حیثیت پوری دنیا سے مختلف اور اپنی اہمیت میں ہر خطۂ زمین سے بڑھ کر ہے، اس لیے کہ وہاں حرمین واقع ہیں۔ ہم ساری دُنیا کا غرقِ معاصی ہونا برداشت کرسکتے ہیں، مگر مکّہ اور مدینہ میں بُرائیوں کا پھیلنا برداشت نہیں کرسکتے۔ یہی بنیادی محرک ہے ہماری اِس پالیسی کا کہ سعودی عرب میں جو حامیِ دین عناصر موجود ہیں ان کی ہر ممکن طریقے سے تائید کریں اور جو عناصر وہاں بُرائیوں کو درآمد کر رہے ہیں ان کے شر سے اس مملکت اور اس کے عوام و خواص کو بچانے کی کوشش کریں۔ سعودی حکومت اور اُس کے حکمرانوں کے ساتھ بھی ہم نے اِسی بنا پر یہ روش اختیار کی ہے کہ اُن کے ہر اچھے کام میں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے، انہیں مزید اچھے کاموں کی ترغیب دی جائے، اور ان کی دولت دنیا کے ہر گوشے میں اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی بھلائی کے لیے زیادہ سے زیادہ صرف کرائی جائے۔ آپ ایسی کوئی مثال نہیں پاسکتے کہ ہم نے ان کے کسی غلط کام کی تائید کی ہو، یا ان کی بیجا مدح و تعریف کی ہو، یا اُن کی خاطر بادشاہی نظام کے متعلق اپنے اصولی موقف میں ذرہ برابر بھی کوئی ترمیم کی ہو۔

۷۔ آپ نے خاص طور پر اسلامک کونسل آف یورپ کی منعقد کردہ بین الاقوامی معاشی کانفرنس کا ذکر کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ اس میں بہت سی بنیادی اسلامی تعلیمات سے انحراف کیا گیا ہے، یا ان میں تحریف کی ہے۔ لیکن میں اس سے بالکل ناواقف ہوں کہ اس میں کن تعلیمات سے انحراف کیا گیا ہے، یا کن تعلیمات میں تحریف کی گئی ہے۔ اگر آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ (باقی بر صفحہ ۴۷)

مطبوعات

حکایاتِ عزیمت مؤلف : بدر عالم صاحب

شائع کردہ : گلستان پبلیکیشنز بتوسط مکتبہ چراغ اسلام ۔ ۴۰ ۔ بی ۔ اُردو بازار لاہور

صفحات : ۹۴ قیمت : ۳/۶۰ روپے

توحیدِ باری تعالیٰ کا عقیدہ ایک انقلابی عقیدہ ہے ۔ جب اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کا نقش دل پر مرتسم ہوتا ہے اور اُس کی توحید کی حکمرانی دماغ پر قائم ہوتی ہے تو دنیا کے تمام جابر و قاہر فرمانرواؤں کی فرمانروائی کے نقش مٹ جاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر پختہ یقین انسان کو پہاڑ جیسا ثبات عطا کرتا ہے تو پھر اس کی گردن کسی کے سامنے خم ہونے سے انکار کر دیتی ہے اور وہ بڑے سے بڑے ظالم و مستبد حکمران کے سامنے بھی کلمۂ حق ادا کرنے سے خوف نہیں کھاتا ۔

زیرِ تبصرہ کتابچہ میں ان عظیم شخصیتوں کی حکایاتِ عزیمت نہایت مختصر اور جامع انداز میں نقل کی گئی ہیں جن کے دل و دماغ پر اللہ کی سروری اور فرمانروائی کا رنگ چڑھ چکا تھا ۔ بنو امیہ اور بنو عباس کا دورِ ظلم و ستم ہو یا مغلیہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ استبداد یا دورِ حاضر کی مسلم استبدادی حکومتیں، ہر دور میں ہمیں ایسی شخصیتیں نمایاں نظر آتی ہیں جنہوں نے قید و بند اور اذیت و عقوبت اور تخریب کے مختلف مرحلوں پر نہایت ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ انجام دیا ۔ کتابچہ میں جہاں امام حسینؓ، سعید بن جبیرؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام حنبلؒ کے ایمان افروز حالاتِ عزیمت ملتے ہیں وہاں مجدد الف ثانی، سعید حلبی، بدیع الزمان، شہید حسن البناء، عبدالقادر عودہ شہید، سید قطب شہید اور مولانا مودودی جیسی شخصیتیں بھی باطل کے سامنے سینہ سپر نظر آتی ہیں ۔ اس طرح تاریخ اسلام اولو العزم اور حق پرست علماء سے کبھی محروم نہیں ہوتی ۔

زیرِ نظر کتابچہ میں ان اصحابِ عزیمت کے ایمان افروز حالات کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ قاری

کا دل اس سے گہرا اثر قبول کرتا ہے۔

قانونِ الٰہی یا انسانی	تالیف: جناب عبدالقادر عودہ شہیدؒ

ترجمہ: محمد منیف ایم اے

شائع کردہ: مکتبہ چراغِ اسلام - ۴۰ - بی اُردو بازار - لاہور -

صفحات: ۹۶ قیمت: ۵/۲۵ روپے

زیر تبصرہ کتاب دَورِ حاضر میں اسلام کے نامور فرزند جناب عبدالقادر عودہ شہیدؒ کی عربی تالیف الاسلام بین جھل ابنائہ وعجز علمائہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ فاضل مصنف نے بڑی دیدہ وری کے ساتھ اسلامی شریعت، اس کے مزاج، اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا جائزہ لیا ہے اور دلائل کے ساتھ اسلامی قانون کی دوسرے قوانین پر برتری ثابت کی ہے۔

ترجمہ شگفتہ اور رواں ہے اور کتابت وطباعت عمدہ ہے۔

رحمٰن کے سایے میں	مؤلف: حافظ محمد ادریس صاحب

ناشر: البدر پبلیکیشنز - اُردو بازار لاہور۔

کتابت وطباعت عمدہ - صفحات: ۱۸۴

قیمت: -/۹ روپے۔

"رحمٰن کے سایے میں" قرآنی دعاؤں کا مجموعہ ہے جسے فاضل نوجوان حافظ محمد ادریس صاحب نے مرتب کیا ہے۔ حافظ صاحب نے قرآنی دعاؤں کا انتخاب کرنے اور اُن کو ترتیب دینے میں بڑے حُسنِ ذوق سے کام لیا ہے۔ زیر نظر کتاب قرآنی دعاؤں کا محض مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں ہر دُعا کا تاریخی پس منظر بھی بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جس کو پڑھ کر انسان اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرتا ہے جس ماحول میں یہ دعائیں زبان پر بے ساختہ جاری ہو گئیں۔ جب ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ یہ دعائیں اللہ کے برگزیدہ

پیغمبروں نے اپنی دعوت کے مختلف مراحل میں مانگی ہیں قرآن کے مطالب میں غیر معمولی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ وہ دعائیں ہیں جو مصائب و تکالیف اور دشمنانِ دعوتِ دین کی اذیت رسانیوں کے پیشِ نظر انبیائے کرام کی مبارک زبانوں سے ادا ہوتی تھیں، اس لیے ان میں مکمل اظہارِ مدعا بھی ہے اور خلوص و للّٰہیت کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ حافظ صاحب نے ان دعاؤں کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے انہی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعیٔ بلیغ فرمائی ہے۔ اور یہی چیز قرآنی دعاؤں کے اس مجموعے کو دوسرے مجموعوں سے منفرد و ممیز کرتی ہے۔

کتاب کا سرورق بہت جاذبِ نظر ہے۔ کتابت و طباعت بھی عمدہ ہے۔ ہماری رائے میں ہر اس شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اپنے خدا کے ساتھ سرگوشیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

فقہائے ہند (جلد دوم) تالیف: مولانا محمد اسحاق بھٹی

ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور

صفحات: ۲۶۴ قیمت: گیارہ روپے پچاس پیسے۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی کے معروف سلسلہ "فقہائے ہند" کی یہ دوسری جلد ہے جو نویں صدی ہجری کے ایک سو پانچ فقہائے برصغیر کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں یہ وہ دور ہے جس میں تیمور لنگ نے اس ملک پر حملہ کیا اور اس کے باشندوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ مقدمہ کتاب میں تیمور لنگ اور اس عہد کے علاوہ ضروری تفصیلات درج ہیں۔ نیز ہند کے مشرقی سلاطین، بہلول لودھی، سلاطینِ گجرات اور سلاطین بہمنیہ کے بارے میں بہترین معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ سو سال کے اس طویل عہد میں ہندوستان کے مختلف علاقوں پر یہی حکمران داد حکمرانی دیتے تھے اور ان کے نزدیک علم و علماء کو انتہائی قدر و منزلت حاصل تھی۔ فاضل مصنف نے پوری محنت سے ان تمام واقعات کو یکجا کر دیا ہے جو مختلف تذکروں اور کتبِ تاریخ میں بکھرے پڑے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کی سرزمین علمی اعتبار سے بڑی زرخیز ہے اور اس کے بلاد و امصار میں ہمیشہ علم کی قدر کی گئی اور علمائے کرام کو عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہوں کے دربار میں بھی اُن کو انتہائی بلند مقام حاصل رہا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں علماء نے بھی اپنے وقار کو بحال رکھا اور بادشاہوں کی بے جا حمایت سے گریز کیا۔ یہ کتاب ہمارے دینی ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

اسلام کا نظامِ عفت و عصمت | مؤلف: مولانا محمد ظفیر الدین صاحب رفیق ندوۃ المصنفین دلی

شائع کردہ: مکتبہ نذیریہ قینچی امرسدھو۔ فیروز پور روڈ۔ لاہور

صفحات: ۳۹۷ قیمت: -/۱۶ روپے

زیرِ تبصرہ کتاب اسلام کے نظامِ عفت و عصمت پر ایک جامع اور فکر انگیز تصنیف ہے جس کو علمی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر بک چکے ہیں۔ اب مکتبہ نذیریہ لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔ کتابت و طباعت کا معیار عمدہ ہے۔

(بقیہ رسائل و مسائل)

معلومات ہم پہنچائیں تو شکرگزار رہوں گا۔

۸۔ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والوں کی شرکت ایسی مجالس میں اس غرض کے لیے ہوتی ہے کہ اسلام کا اصلی نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے، اور اگر کوئی غلط نقطۂ نظر پیش کیا جا رہا ہو تو اس کی اصلاح کے لیے کوشش کی جائے۔ میرے علم میں یہ بات پہلی مرتبہ آئی ہے کہ ایسی کسی کانفرنس میں ہمارے کسی آدمی کی شرکت کسی حکومت کی پالیسیوں کو جواز فراہم کرنے کی ہم معنی ہوتی ہے۔

(بقیہ اشارات) مخالفین کا اثر و رسوخ معاشرے میں بتدریج بڑھ رہا ہے تو وہ اختلاف کی ہر آواز کو بالجبر دبانے کی کوشش کرتا ہے اور اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے وہ انتہائی ظلم و تشدد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جو لوگ اس کی ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہیں ہوتے انہیں حوالۂ زنداں کیا جاتا ہے، اُن پہ رزق کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان کو اور اُن کے اہل خانہ کو مختلف حیلوں بہانوں سے ستایا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ سارے مصائب سہ کر بھی اُسے فوق البشر ماننے اور اُس کی غلامی اختیار کرنے پہ رضامند نہ ہوں تو پھر انہیں موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ جبر و تشدد، اغوا، مخالفوں کی تذلیل اور اُن کا قتل، یہ وہ عام ہتھکنڈے ہیں جو ہر مستبد کردار کشی کے علاوہ مخالفین کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے بے محابا استعمال کرتا ہے۔ لیکن تاریخ کا یہ بھی ایک اٹل فیصلہ ہے کہ یہ سارے ظالمانہ حربے کسی مستبد کے المناک زوال کو کبھی روک نہیں سکے ہیں۔ ہر حکمران جو عدل و انصاف کی راہ چھوڑ کر ظلم و استبداد کی راہ اختیار کرتا ہے وہ اپنی بربادی کو آپ دعوت دیتا ہے اور جو احمق خود برباد ہونے کا تہیہ کر لے اُسے اپنے المناک انجام سے آخر کس طرح بچایا جاسکتا ہے۔

قرآن حکیم کا نچوڑ آسان اُردو میں پڑھیے

دی چلڈرن قرآن سوسائٹی ۱۴ وحدت روڈ لاہور نے قرآن مجید کا نچوڑ **۲۶** خوبصورت
دیدہ زیب کتب کی صورت میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اِن میں سے مندرجہ ذیل کتب چھپ گئی ہیں
ان کتابوں کو تیسری اور اس سے اونچی جماعت کا طالب علم پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ غیر تعلیم یافتہ ان کو سن کر قرآن حکیم
سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ کتابوں کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ سب سے زیادہ مہربان انسان
۲۔ سب سے بڑے جرنیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ بچوں کے لیے نماز مترجم
۴۔ بچوں سے پیار کرنے والے رسولؐ
۵۔ جان اور مال سے جہاد کرنے والے مجاہد حصہ اول
۶۔ جان اور مال سے جہاد کرنے والے مجاہد حصہ دوم

کتاب نمبر ۷ تا ۱۶ ۔ قصص القرآن حصہ اول تا دہم (دسواں)۔ اس میں حضرت آدمؑ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
تک کے حالات قرآن حکیم کے مطابق درج کیے گئے ہیں اور ہر قصے کے آخر میں اس کے نتائج بھی دیے
گئے ہیں۔ جنہوں نے اللہ کے احکام تسلیم کیے وہ نوازے گئے اور جنہوں نے نافرمانی کی وہ نیست و نابود
کر دیے گئے۔

کتاب نمبر ۱۷ تا ۲۶ ۔ ان میں قرآن حکیم کے دیگر مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ ایمان۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔
زکوٰۃ۔ حقوق والدین۔ حقوق زوجین۔ حقوق اولاد۔ حقوق ہمسائیگان۔ معراج وغیرہ وغیرہ۔ اس کا نام
احکام الٰہی و فرمان رسول حصہ اول تا دہم ہے۔ یہ زیر تصنیف ہیں۔

۱ تا ۱۶ کتابوں کی قیمت سوائے کتاب نمبر ۱۶ فی کتاب مبلغ تین روپے ہے۔ کتاب نمبر ۱۶ جو ۲۳۸ صفحات
پر مشتمل ہے جس کی قیمت ۵/- روپے ہے۔ ان کتابوں کو خود خرید کر پڑھیں۔ اپنے بچوں کو پڑھا کر اور
غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو سنا کر قرآن حکیم کا نور پھیلائیں اور اپنے دین و دنیا۔ آخرت کو بہتر بنائیں۔

یہ سب کتابیں سوسائٹی اور کتب فروشوں سے مل سکتی ہیں

دی چلڈرن قرآن سوسائٹی ۱۴ وحدت روڈ لاہور
فون نمبر ۳۵۳۳۸۹

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جون ۱۹۶۶ء